خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

مدیر
وہاب صدیقی

۴-۱۱ جنوری ۱۹۷۳ء
قیمت : ——— ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ——— ایک روپیہ

جلد :- ۳ شمارہ :- ۳۴

اداریہ

پی-ایف-یو-جے- زندہ باد

ہر آنکہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ مانیست

۴ جنوری ۱۹۷۳ء کو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (وفاقی انجمنِ صحافیانِ پاکستان) کی دو سالہ کانفرنس کراچی میں شروع ہو رہی ہے۔ اس کانفرنس کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور اس کے آزادیٔ پریس کی جدوجہد پر گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

وفاقی انجمنِ صحافیانِ پاکستان نے انتہائی دلیری، بہادری اور پامردی سے ان شرمناک ہتھکنڈوں اور عوام دشمن کوششوں کا مقابلہ کیا ہے جن کا مقصد آزادیٔ پریس کو سلب کرنا تھا۔ صحافیوں کی اس واحد نمائندہ تنظیم کی عظمت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے کارکن اور رہنما فوجی آمریتوں کے سامنے بھی سینہ سپر رہے۔ اصولوں کو قربان نہیں کیا بلکہ ان کو بلند رکھنے کے جرم میں ہر دور میں ہر قسم کی قربانی دی۔ عظیم ہے پی-ایف-یو-جے، قابلِ تعظیم ہیں وہ رہنما اور کارکن جنہوں نے حق و صداقت کا علم بلند رکھا۔ ہم انہیں سلام کرتے ہیں۔

جیسا کہ یہ عظیم انجمن ہر دور میں "عتاب شاہی" کا شکار رہی ہے اور اسے توڑنے، ختم کرانے، پھوٹ ڈلوانے اور اس کے مقابلے میں مخالف تنظیموں کے قیام کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ مگر انہیں اور ان کے تنخواہ دار ایجنٹوں اور ضمیر فروشوں موقع پرستوں کو ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ آج بھی حالات کچھ ایسے ہی ہیں اور پی-ایف-یو-جے ایک نئے چیلنج سے دوچار ہے۔

وزارت اطلاعات کھلم کھلا ۴ جنوری کو ہونے والی کانفرنس پر اثر انداز ہونے میں مصروف رہی ہے۔ بعض اوقات براہ راست اور بعض جگہوں پر بالواسطہ یہ انتظام کیا گیا کہ پی-ایف-یو-جے کے انتخابات میں اپنی مرضی کے عہدیداروں کو لایا جائے۔ کتنا شرمناک اقدام ہے کہ بعض مندوبین کو یہ کہا گیا کہ وہ منہاج برنا

خاص مضامین

سرورق : نیّر خان

فون :- ۴۱۲۲۷۴

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح - ۸۰ ڈی، نرسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا

جو انجمن کے سیکریٹری جنرل ہیں اور صدارتی امیدواروں میں سے ایک ہیں انہیں کسی صورت میں کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔

دیکھا آپ نے، یہ کام اُس حکومت کے دور میں ہو رہا ہے جو آزادیٔ تحریر و تقریر کی علم بردار ہے۔ وزارتِ اطلاعات سے پوچھا جائے کہ منہاج برنا کی مخالفت کیوں کی جا رہی ہے؟ وزارت اطلاعات کے ہر بڑے چھوٹے افسر کو کانفرنس کے دوران کراچی میں پڑاؤ ڈالنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ہے؟

ہمیں اس امر کا اعتراف کرنے میں فخر ہے کہ وزارتِ اطلاعات نے جناب حفیظ پیرزادہ کے دور میں صحافیوں سے کئے گئے وعدوں کو پورا کرنے میں مؤثر کارروائی کی۔ صحافیوں کو بحال کرایا اور ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے سے گریز کیا مگر مولانا کوثر نیازی کا چارج سنبھالنا تھا کہ حکومت کی تمام پالیسیاں صحافت دشمن اور۔ پی۔ ایف۔ یو۔ جے کے خلاف معاندانہ ہو گئیں۔ باقی صحافیوں کی بحالی کا معاملہ کھٹائی میں ڈال دیا گیا۔ این۔ یو۔ جے۔ کے مردہ بدن میں روح پھونکنے کے لئے "لیپندوں"، کو ٹٹولا مگر اس کے جسم میں ہر انجکشن بے اثر ہو گیا۔ اس کا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور قبرستان کی سی خاموشی طاری تھی لہٰذا وزارتِ اطلاعات کو فاتحہ و درود پر ہی قناعت کرنا پڑی۔

اس بے بسی میں سازشوں کا راستہ اپنانے کے علاوہ کوئی دوسرا چارۂ کار نہ تھا۔ معاشی مجبوریوں کے شکار کہاں نہیں ہوتے، ایسے لوگ پہلے حکمرانوں نے بھی تلاش کر لیئے تھے اور اب وزارتِ اطلاعات کو ایک دو طالع آزما مل گئے ہیں یہ نئی بات نہیں۔ ان میں کتنا پانی ہے، اس کا اندازہ تو ہو چکا ہو گا اور باقی انتخابات میں ہو جائے گا، بات صرف اتنی ہے کہ حکومت، مداخلت کی مرتکب ہوئی ہے جو قابلِ مذمت ہے اور جس سے صحافی برادری میں حکومت کے وقار کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔

حکومت سے ہماری گذارش ہے کہ حضور اپنے کام سے مطلب رکھیئے۔ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے اور اگر آپ میں کچھ خلوص کی رمق باقی ہے اور اپنے پروگرام اور منشور کی کچھ لاج رکھنی ہے تو اپنی غلطیوں کا ازالہ کیجئے، پریس کے خلاف بنائے ہوئے تمام کالے قوانین کو منسوخ کیجئے، اشتہارات اور نیوز پرنٹ کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال نہ کیجئے۔ اخباری وڈیروں پر زور ڈالئے کہ وہ ٹریڈ یونین ازم کے اصولوں کو تسلیم کرتے ہوئے صحافیوں اور پریس ورکروں کے ٹریڈ یونین حقوق پر ڈاکہ نہ ڈالیں۔ اس بات پر غور کریں کہ صحافیوں کی اُجرتیں آج سے بارہ سال پہلے مقرر ہوئی تھیں اور آج اشیاء کی قیمتیں کئی سو گنا بڑھ چکی ہیں لہٰذا وہ اُجرتوں میں اضافہ کے مستحق ہیں۔

ہمیں نہیں معلوم کہ حکومت ہماری ان گذارشات پر کان دھرے گی یا نہیں، لیکن ہم۔ پی۔ ایف۔ یو۔ جے کی انقلابی روایات کے پیشِ نظر۔ پی۔ ایف۔ یو۔ جے سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنی اصولی جدوجہد جاری رکھے گی۔ کیونکہ۔

ع ہر آنکہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

جرائم میں اضافہ

ملک میں جرائم کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر روز چوری، ڈکیتی، قتل اور اغوا کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ گذشتہ سالوں کے تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے ہیں۔ کراچی میں دو جوہریوں کی دوکانوں کو لوٹا جا چکا ہے۔ پولیس کی تعداد میں اضافہ کرنے کے باوجود جرائم کی روک تھام نہیں ہو سکی ہے۔ کراچی میں گشتی پولیس میں اضافہ کر دیا گیا ہے رات کو چوراہوں پر رائفل بردار سپاہی کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن چوری اور ڈکیتی کی وارداتوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پولیس کو سیاست میں ملوث کر دیا گیا ہے۔ اس کی پوری صلاحیت اور کارکردگی سیاست دانوں، مزدوروں، کسانوں اور طلبہ کارکنوں کی نگرانی میں صرف ہو جاتی ہے۔ شاید اربابِ اقتدار یہ سمجھتے ہیں کہ جرائم کی وجہ سیاست دان اور سیاسی کارکن ہیں۔ اور سیاسی سرگرمیوں کو کچلنے سے اخلاقی جرائم کم ہو جائیں گے۔

اربابِ اقتدار کو چاہیئے کہ پولیس کو سیاسی سرگرمیوں کو کچلنے اور سیاست میں ملوث کرنے کی بجائے اخلاقی جرائم کی روک تھام کے لئے استعمال کرے۔ کیونکہ۔ غنڈہ گردی اور اخلاقی جرائم کی بڑھتی ہوئی تعداد نے شہریوں کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ اور کسی کی عزت محفوظ نہیں۔

قارئین سے اپیل

قارئین کرام، جیسا کہ آپ کو علم ہے ان دنوں "الفتح" شدید مالی مشکلات کا شکار ہے۔ الفتح کے خلاف انتقامی کارروائیاں عمل میں لائی جا رہی ہیں ہمارا جرم صرف یہ ہے کہ ہم حق بات کہنے سے نہیں جھجکتے۔ ہم "بڑے"، لوگوں کی طرف نہیں دیکھتے، بلکہ عام لوگوں پر انحصار کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کا تعاون حاصل رہا تو ہم ہر بدعنوانی کو بے نقاب کرتے رہیں گے۔

آپ سے درخواست ہے کہ ان نامساعد حالات میں "الفتح" کو سہارا دینے کی کوشش کریں۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں میں "الفتح"، کو روشناس کرایئے۔ خود بھی سالانہ خریدار بنیئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔ آپ کی یہ مدد ہمارے حوصلوں اور جذبوں کو جلا بخشے گی: شکریہ۔

الفتح

پاکستان کو "یونین آف سوشلسٹ ری پبلکس آف پاکستان" کا نام دیا جائے

آئین میں سوشلزم کہاں ہے؟

واقفِ حال

۱۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں آئین کا مسودہ پیش کر دیا گیا۔ مسودۂ آئین کے اہم نکات یہ ہیں۔

و — وفاقی پارلیمانی نظام دو ایوانی مقننہ پر مشتمل ہوگا اور مملکت کا سربراہ صدر ہوگا۔

و — قومی اسمبلی دو سو ارکان پر مشتمل ہوگی، جس کے ممبران بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست منتخب ہوں گے۔ سینیٹ کے ۶۰ رکن ہوں گے ہر صوبائی اسمبلی سینیٹ کے ۱۴ ارکان منتخب کرے گی، قومی اسمبلی، وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں سے دو ارکان منتخب کرے گی اور دو رکن صدر کے مقرر کردہ طریقے کے مطابق وفاقی دارالحکومت سے چنے جائیں گے۔

و — وفاق کے نظم و نسق کے اختیارات، وفاقی حکومت استعمال کرے گی، انتظامیہ کا سربراہ وزیرِ اعظم ہوگا۔

و — صوبوں میں ایک اسمبلی، وزیرِ اعلیٰ اور گورنر ہوں گے، بلوچستان اسمبلی کے ۴۰، سرحد کے ۸۰، پنجاب کے دو سو اور سندھ اسمبلی کے ۱۰۰ رکن ہوں گے۔

و — پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا۔

و — اسلامی نظریہ کی کونسل تشکیل دی جائے گی۔

و — سابقہ دستوروں میں جو بنیادی حقوق دیئے گئے تھے وہ برقرار رکھے گئے ہیں، اور بعض نئی گنجائشیں رکھی گئی ہیں۔ جو انسانی وقار اور سیاسی پارٹیوں کی آزادی سے متعلق ہیں۔

و — صوبائی حکومت کو اپنے صوبہ میں بجلی کے استعمال پر ٹیکس عاید کرنے اور بجلی گھر وغیرہ تعمیر کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

و — عالیہ کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔

و — مشرقی پاکستان سے بیرونی جارحیت اور اس کے اثرات کے خاتمہ کے بعد وہاں کے عوام کو وفاق کے امور میں نمائندگی دینے کے لئے آئین میں مناسب ترمیم کی جائے گی۔

و — آئین میں ترمیم کے لئے طریقِ کار میں سینیٹ کو مساوی حقوق دیئے گئے ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ یہ مسودۂ آئین کس حد تک پاکستان کے عوام کے جذبات اور امنگوں کا آئینہ دار ہے۔ اکثریت کے حقوق کا تحفظ کہاں تک کیا گیا ہے۔

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی اکثریت پاکستان پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی پر مشتمل ہے۔ اس لئے آئین سازی کی بنیادی ذمہ داری انہی دو جماعتوں پر عائد ہوتی ہے۔ نئے آئین کی اچھائیوں اور برائیوں کی ذمہ دار بھی یہی ہوں گی۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی اپنے آپکو سوشلسٹ پارٹی ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ اپنی انتخابی مہم اور پارٹی کے منشور میں سوشلسٹ معیشت اور سوشلسٹ سیاست اختیار کرنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن آئین میں نئے سیاسی اور معاشی نظام کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس وجہ سے عوام کے ذہنوں میں طرح طرح کے سوالات اور شک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں، وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کیا پاکستان پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی، جو بظاہر جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ اور غیر ملکی نوآبادیاتی استحصال کے خلاف جدوجہد کا علَم لے کر اٹھی تھیں، کوئی ایسا دستور بنانا چاہتی ہیں، جس کا سوشلزم سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو، یا پھر یہ دونوں جماعتیں عوام کو یہ تاثر دینا چاہتی ہیں کہ دستور کا تعلق سوشلسٹ نظریات اور سرمایہ دارانہ نظریات سے نہیں ہوتا، اور وہ معاشرہ کے اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی نظام سے علیحدہ کوئی ایسی آفاقی شے ہے، جس کا ملک کی معیشت، سیاست اور معاشرت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ان شک و شبہات کی وجہ یہ ہے کہ پیپلز پارٹی اور نیپ نے کہا ہے کہ آئین کا سوشلسٹ اور غیر سوشلسٹ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لیکن بحیثیت سوشلسٹ کے، ہمارا دعویٰ ہے کہ ملک کے سیاسی، معاشرتی اور خصوصاً اقتصادی نظام کی مخصوص راہِ عمل کو پیشِ نظر رکھ کر ہی دساتیر بنائے جاتے ہیں، دنیا کا کوئی دستور یا قانون، چاہے سوشلسٹ ہو یا جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ اور نوآبادیاتی ہو، ایک طبقے کے لئے ہو یا تمام عوام کے لئے، اس کی جڑیں ملک کے مخصوص اقتصادی نظام سے وابستہ ہوتی ہیں۔ جیسا کسی معاشرہ یا ملک کا اقتصادی ڈھانچہ ہوتا ہے، ویسے ہی اس معاشرہ یا ملک کا دستوری اور قانونی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ کسی معاشرہ یا ملک کی تمام سیاست، آداب، اخلاق اور معاشرتی، دستوری اور قانونی اقدار اور ضابطے کی بنیاد اس بات پر ہوتی ہے کہ ذرائع پیداوار اور وسائل دولت پر کس طبقے کی حکمرانی ہے، پیداواری قوتیں کون سی ہیں، تقسیم اور تبادلے کے طریقے کیا ہیں۔ غرض کہ ملک کے اقتصادی نظام کی بنیاد پر ہی سیاسی، اخلاقی معاشرتی، دستوری اور قانونی ضابطے بنائے جاتے ہیں۔ کارل مارکس نے بہت پہلے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

> "معاشرہ کی معاشی ساخت ہی وہ حقیقی اساس ہوتی ہے جس پر کسی معاشرہ کی سیاست، اخلاق معاشرت، قانون اور دستور کی بالائی عمارت تعمیر کی جاتی ہے ——"

اگر سوشلسٹ معیشت اور سوشلسٹ معاشرہ کے قیام کی داعی پیپلز پارٹی اور نیپ خالصتاً "بورژوا ریاستوں جیسے دستور کا نفاذ پاکستان میں کرتی ہیں، تو ان کے سوشلسٹ ہونے کے دعویٰ کی نفی ہوتی ہے۔ اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہ دونوں جماعتیں نہ تو سوشلسٹ ہیں اور نہ سوشلسٹ معاشرہ کا قیام چاہتی ہیں۔ کیونکہ بورژوا دستور اور سوشلسٹ معاشرہ کے قیام کی جدوجہد کے مابین رابطے سے زیادہ تضاد ہے، اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ دستور ساز اسمبلی میں پیش کردہ مسودہ

پاکستان کو "یونین آف سوشلسٹ ری پبلکس آف پاکستان" کا نام دیا جائے

آئین میں سوشلزم کہاں ہے؟

واقفِ حال

۱۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں آئین کا مسودہ پیش کر دیا گیا۔ مسودۂ آئین کے اہم نکات یہ ہیں۔

و — وفاقی پارلیمانی نظام دوایوانی مقننہ پر مشتمل ہوگا اور مملکت کا سربراہ صدر ہوگا۔

و — قومی اسمبلی دو سو ارکان پر مشتمل ہوگی، جس کے ممبران بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست منتخب ہوں گے۔ سینیٹ کے ۶۰ رکن ہوں گے ہر صوبائی اسمبلی سینیٹ کے ۱۴ ارکان منتخب کرے گی، قومی اسمبلی، وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں سے دو ارکان منتخب کرے گی اور دو رکن صدر کے مقرر کردہ طریقے کے مطابق وفاقی دارالحکومت سے چنے جائیں گے۔

و — وفاق کے نظم و نسق کے اختیارات، وفاقی حکومت استعمال کرے گی، انتظامیہ کا سربراہ وزیرِ اعظم ہوگا۔

و — صوبوں میں ایک اسمبلی، وزیرِ اعلیٰ اور گورنر ہوں گے، بلوچستان اسمبلی کے ۴۰، سرحد کے ۸۰، پنجاب کے دو سو اور سندھ اسمبلی کے ۱۰۰ رکن ہوں گے۔

و — پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا۔

و — اسلامی نظریہ کی کونسل تشکیل دی جائے گی۔

و — سابقہ دستوروں میں جو بنیادی حقوق دیئے گئے تھے، وہ برقرار رکھے گئے ہیں، اور بعض نئی گنجائشیں رکھی گئی ہیں۔ جو انسانی وقار اور سیاسی پارٹیوں کی آزادی سے متعلق ہیں۔

و — صوبائی حکومت کو اپنے صوبہ میں بجلی کے استعمال پر ٹیکس عاید کرنے اور بجلی گھر وغیرہ تعمیر کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

و — عالیہ کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔

و — مشرقی پاکستان سے بیرونی جارحیت اور اس کے اثرات کے خاتمہ کے بعد وہاں کے عوام کو وفاق کے امور میں نمائندگی دینے کے لئے آئین میں مناسب ترمیم کی جائے گی۔

و — آئین میں ترمیم کے لئے طریقِ کار میں سینیٹ کو مساوی حقوق دیئے گئے ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ یہ مسودۂ آئین کس حد تک پاکستان کے عوام کے جذبات اور امنگوں کا آئینہ دار ہے۔ اکثریت کے حقوق کا تحفظ کہاں تک کیا گیا ہے۔

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی اکثریت پاکستان پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی پر مشتمل ہے۔ اس لئے آئین سازی کی بنیادی ذمہ داری انہی دو جماعتوں پر عائد ہوتی ہے۔ نئے آئین کی اچھائیوں اور برائیوں کی ذمہ دار بھی یہی ہوں گی۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی اپنے آپ کو سوشلسٹ پارٹی ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ اپنی انتخابی مہم اور پارٹی کے منشور میں سوشلسٹ معیشت اور سوشلسٹ سیاست اختیار کرنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن آئین میں نئے سیاسی اور معاشی نظام کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس وجہ سے عوام کے ذہنوں میں طرح طرح کے سوالات اور شک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں، وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کیا پاکستان پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی، جو بظاہر جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ اور غیر ملکی نوآبادیاتی استحصال کے خلاف جدوجہد کا علم لے کر اٹھی تھیں، کوئی ایسا دستور بنانا چاہتی ہیں، جس کا سوشلزم سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو، یا پھر یہ دونوں جماعتیں عوام کو یہ تاثر دینا چاہتی ہیں کہ دستور کا تعلق سوشلسٹ نظریات اور سرمایہ دارانہ نظریات سے نہیں ہوتا، اور وہ معاشرہ کے اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی نظام سے علیحدہ کوئی ایسی آفاقی شے ہے، جس کا ملک کی معیشت، سیاست اور معاشرت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ان شک و شبہات کی وجہ یہ ہے کہ پیپلز پارٹی اور نیپ نے کہا ہے کہ آئین کا سوشلسٹ اور غیر سوشلسٹ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لیکن بحیثیت سوشلسٹ کے، ہمارا دعویٰ ہے کہ ملک کے سیاسی، معاشرتی اور خصوصاً اقتصادی نظام کی مخصوص راہِ عمل کو پیشِ نظر رکھ کر ہی دساتیر بنائے جاتے ہیں، دنیا کا کوئی دستور یا قانون، چاہے سوشلسٹ ہو یا جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ اور نوآبادیاتی ہو، ایک طبقے کے لئے ہو یا تمام عوام کے لئے، اس کی جڑیں ملک کے مخصوص اقتصادی نظام سے وابستہ ہوتی ہیں۔ جیسا کسی معاشرہ یا ملک کا اقتصادی ڈھانچہ ہوتا ہے، ویسے ہی اس معاشرہ یا ملک کا دستوری اور قانونی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ کسی معاشرہ یا ملک کی تمام سیاست، آداب، اخلاق اور معاشرتی، دستوری اور قانونی اقدار اور ضابطے کی بنیاد اس بات پر ہوتی ہے کہ ذرائع پیداوار اور وسائل دولت پر کس طبقے کی حکمرانی ہے، پیداواری قوتیں کون سی ہیں، تقسیم اور تبادلے کے طریقے کیا ہیں۔ غرض کہ ملک کے اقتصادی نظام کی بنیاد پر ہی سیاسی، اخلاقی معاشرتی، دستوری اور قانونی ضابطے بنائے جاتے ہیں۔ کارل مارکس نے بہت پہلے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"معاشرہ کی معاشی ساخت ہی وہ حقیقی اساس ہوتی ہے جس پر کسی معاشرہ کی سیاست، اخلاق معاشرت، قانون اور دستور کی بالائی عمارت تعمیر کی جاتی ہے ——"

اگر سوشلسٹ معیشت اور سوشلسٹ معاشرہ کے قیام کی داعی پیپلز پارٹی اور نیپ خالصتاً بورژوا ریاستوں جیسے دستور کا نفاذ پاکستان میں کرتی ہیں، تو ان کے سوشلسٹ ہونے کے دعویٰ کی نفی ہوتی ہے۔ اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہ دونوں جماعتیں نہ تو سوشلسٹ ہیں اور نہ سوشلسٹ معاشرہ کا قیام چاہتی ہیں۔ کیونکہ بورژوا دستور اور سوشلسٹ معاشرہ کے قیام کی جدوجہد کے مابین رابطے سے زیادہ تضاد ہے، اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ دستور ساز اسمبلی میں پیش کردہ مسودہ

یہ آئین عوام الناس کے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتا

آئین میں دوسری تمام باتوں کے علاوہ اس بات کی تحریری وضاحت لازمی ہے کہ پاکستان کے مستقبل کا اقتصادی نظام قلیل المعیاد اور طویل المعیاد بنیادوں پر کیا ہوگا؟ ملک میں رہنے والے مختلف علاقوں اور مختلف قومیتوں سے وابستہ افراد کے مابین تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی؟ ایک ہی قومیت اور ایک ہی صوبے میں بسنے والے محنت کشوں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے درمیان کس قسم کے تعلقات ہوں گے؟ آئین میں ان سوالات کی وضاحت ضروری ہے۔ اگر ان مسائل کو آئین میں سائنسی سوشلزم کے اصولوں کے مطابق حل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ تو آئین بورژوا نوعیت کا ہوگا۔ جس کے نتیجہ میں نہ قومیتوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے گا اور نہ ہی محنت کشوں اور عوام الناس کی اکثریت کے بنیادی حقوق، شہری آزادیوں اور اقتصادی رشتوں کا تحفظ ہو سکے گا۔

مسودۂ آئین میں بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کی ضمانت دی گئی ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں بھی تحفظ دیا گیا تھا۔ اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت دی گئی تھی۔ لیکن اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ اقلیتوں کے حقوق کو پامال کیا گیا ظلم و تشدد کیا گیا۔ قانونی تحفظ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اگر اس پر عمل کیا جاتا تو شاید برصغیر کی تقسیم کی نوبت نہیں آتی۔ اقلیتوں کے حقوق کے قانونی تحفظ کی ناکامی کے بعد ہی آل انڈیا مسلم لیگ کو جداگانہ وطن کا خیال آیا۔ اور قرارداد پاکستان منظور کی۔

۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دساتیر میں بھی بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کی ضمانت دی گئی تھی، دونوں دساتیر میں کہا گیا تھا کہ زیر حراست شخص کو ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر عدالت میں پیش کرنا ضروری ہوگا، کسی شخص کو ایک سال سے زیر حراست نہیں رکھا جائے گا۔ لیکن وطن عزیز کے مزدور، کسان، طلبہ اور عوام اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ آئینی ضمانت محض دکھاوا تھی، ایک ایک، دو دو ہفتے تک زیر حراست افراد کو عدالت میں پیش نہیں کیا جاتا تھا، اور پانچ پانچ سال تک لوگوں کو حراست میں رکھا جاتا تھا، پاکستان پیپلز پارٹی کے بنائے ہوئے عارضی آئین میں بھی بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کی ضمانت دی گئی تھی، لیکن اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ بلکہ پیپلز پارٹی نے سیاسی رہنماؤں کے خلاف اخلاقی جرائم کے تحت مقدمات چلانے کی نئی روایت قائم کی، یہی حال مسودۂ آئین میں پیش کردہ بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کا ہوگا۔ کیونکہ نظام معیشت اور سیاست جو پہلے تھا، اب بھی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ کسی بورژوا ریاست میں اعلیٰ سے اعلیٰ بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کی دستوری ضمانت دینے کے باوجود معاشرہ کی اکثریت یعنی مزدوروں، کسانوں طلبہ اور عوام الناس کو بنیادی حقوق اور شہری آزادیاں نہیں ملتیں۔ ان مظلوم طبقات کو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مقابلے میں کبھی بھی اور کسی صورت میں بھی مساوی شہری آزادیاں، بنیادی حقوق ترقی اور خوشحالی حاصل کرنے کے ذرائع حاصل نہیں ہوتے، کیونکہ معاشرہ کا بنیادی ڈھانچہ جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ اور نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ پر ہوتا ہے۔ اور اس غیر متوازن اقتصادی ڈھانچے کی وجہ سے ہمیشہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو محنت کشوں کے مقابلے میں وسیع تر اور ہمہ گیر اختیارات اور آزادیاں حاصل ہوتی ہیں۔

اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ دستور ساز اسمبلی کی اکثریتی جماعتیں، پیپلز پارٹی اور نیپ، جو سوشلزم کا نعرہ لگاتی ہیں، کی ذمہ داری ہے کہ وہ آئین میں اس امر کی وضاحت کریں کہ پاکستان کا طویل المعیاد اور قلیل المعیاد اقتصادی نظام کیا ہوگا، اس کی عام راہ عمل کیا ہوگی؟ کیا سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ پر دستوری یا قانونی پابندیاں عائد کی جائیں گی یا نہیں؟ کیا آئین غیر طبقاتی معاشرہ کے قیام کے لئے راہ عمل متعین کرے گا یا بورژوا ریاستوں کے دستور کی مانند سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے طبقاتی مفادات کا تحفظ کرے گا؟ کیا ملک کے وسائل دولت، ذرائع پیداوار کھیتوں، کھلیانوں، تجارت، بنکنگ، انشورنس اور تمام صنعتی اداروں پر طویل المعیاد اور قلیل المعیاد پروگرام کے تحت عوام کی حاکمیت تسلیم کی جائے گی یا چھوٹی موٹی اصلاحات کرکے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی حاکمیت قائم رہے گی؟ کیا روزگار اور صلاحیت کے مطابق کام اور ملازمت مہیا کرنے کی ضمانت دی جائے گی یا نہیں؟ جب تک ان بنیادی باتوں کی آئین میں وضاحت نہ ہوگی اس وقت تک آئین مزدوروں، کسانوں اور عوام الناس کی اکثریت اور قومیتوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکے گا۔

مسودہ آئین میں پاکستان میں بسنے والی مختلف قومیتوں، جغرافیائی حدود، سیاسی اور معاشی حقوق کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ کیا یہ دستور اپنے وفاقی آئین ہونے کے دعوی کے ساتھ ساتھ اس امر کی صاف الفاظ میں وضاحت کرے گا کہ پاکستان ایک قوم کی ریاست ہے۔ یا یہ بہت سی قومیتوں کی کثیر الاقوام ریاست ہے؟ کیا وفاقی یونٹوں کو قومیت کے یونٹ کے نام پر مکمل داخلی خود مختاری یعنی نہ صرف سیاسی خود مختاری بلکہ قومیتوں کو اپنے علاقوں کے وسائل دولت اور ذرائع پیداوار کو استعمال کرنے، فائدہ اٹھانے اور اپنے عوام کے مفادات کے لئے استعمال کرنے کی آزادی ہوگی یا نہیں؟ قومیتوں کو اپنی تہذیب، تمدن، ثقافت، ادب اور زبان کو فروغ دینے کے مواقع دیئے جائیں گے یا نہیں؟ بین الصوبائی استحصال کا خاتمہ کیا جائے گا یا نہیں؟ اور وفاقی مرکز اور قومیتی یونٹوں کے درمیان سیاسی اور اقتصادی حقوق، ذمہ داریوں اور فرائض کی نوعیت کیا ہوگی؟

جب تک قومیتوں کے مسئلے کو صحیح طور پر طے نہیں کیا جائے گا۔ اور دستور میں وفاقی یونٹوں کی داخلی خود مختاری تسلیم نہیں کی جائے گی اس وقت تک صحیح معنوں میں پاکستان کا تحفظ ناممکن ہے۔ ماضی میں قومیتوں کا مسئلہ نظر انداز کیا گیا۔ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دساتیر میں اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی گئی۔ جس کا خمیازہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں ادا کرنا پڑا۔ اگر اب بھی ماضی سے سبق حاصل نہ کیا گیا اور دستوری الفاظ کی موشگافیوں میں اسے نظر انداز کیا گیا۔ تو ملک ایک بار پھر خانہ جنگی اور انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ اگر پاکستان کو مزید ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانا چاہتے ہیں۔ تو پاکستان پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کا فرض ہے کہ وہ ماضی کے سازشی طریقوں کو ترک کرکے اور سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ ذہنیت سے بچ کر کھلے انداز میں دستور میں اس بات کو تسلیم کریں کہ پاکستان ایک کثیر الاقوامی ریاست ہے۔ اور اس میں چھوٹی اور بڑی قومیتوں کو مساوی سیاسی اور معاشی حقوق حاصل ہوں گے۔ وفاقی یونٹ داخلی طور پر خود مختار ہوں گے۔ اور بین الصوبائی استحصال کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

کیونکہ قومیتوں کا مسئلہ، ان کے حقوق ان کی سیاسی اور معاشی آزادیوں کا مسئلہ طبقاتی مسئلہ ہے۔ اور لینن اور اسٹالن نے کہا ہے کہ

"قومیتوں کا مسئلہ اپنے آخری تجزیہ میں طبقات کا مسئلہ ہے"

اس لئے اس کا تعلق اس بات سے بھی ہے کہ آئین میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کو تحفظ دینے کی بجائے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے خاتمے کا اعلان کیا جائے۔ کیونکہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کا لازمی نتیجہ علاقائی اور چھوٹی قومیتوں کے استحصال کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ بورژوا دستور اور ریاست میں وفاقی یونٹوں کا تصور صوبائی ہوتا ہے ـ جب کہ سوشلسٹ دستور میں وفاقی یونٹوں کی بنیاد قومیتوں پر ہوتی ہے۔ اس لئے قومیتوں کے حقوق تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان کو یونین آف سوشلسٹ ریپبلک آف پاکستان کا نام دیا جائے۔

شناختی کارڈوں کا رواج فسطائی حکومتوں کے مزاج کے مطابق ہے

شناختی کارڈ — شہری آزادیوں کو کچلنے کا منصوبہ

احفاظ الرحمٰن

دنیا کے جن ممالک میں فسطائیت کا غلبہ ہے، وہاں مخالف سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کو کچلنے کے لئے جدید سائنسی حربے اختیار کئے جاتے ہیں۔ شناختی کارڈ جاری کرنے کا طریقہ بھی اسی مقصد کے تحت رائج کیا جاتا ہے کہ مخالف سیاسی جماعتوں کو آسانی سے تشدد کا نشانہ بنایا جاسکے۔ اب پاکستان کی حکومت بھی اس اسکیم پر عمل درآمد کا منصوبہ بنا رہی ہے۔

فسطائیت اور آمریت کی طرف رجحان رکھنے والی، دوسرے ممالک کی حکومتوں نے شناختی کارڈوں کی مدد سے اپنے ہاتھ مضبوط کرنے میں خاصی "کامیابی" حاصل کی ہے۔ ان ممالک میں مخالف سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کے لئے شناختی کارڈوں کا نسخہ بڑا کارگر ثابت ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں حکومت کی مخالفت میں کوئی آواز نہیں اٹھتی، کیوں کہ جو مخالفت کرتا ہے اور عوام کو سرکار، دربار کے مظالم کے خلاف منظم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسے خاموشی سے قتل کر دیا جاتا ہے۔ سیاسی کارکنوں کی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے ان کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ وہ جہاں کہیں جاتے ہیں، ان کے شناختی کارڈ چیک کئے جاتے ہیں۔ ہر شہر اور ہر قصبے کے باہر چیک پوسٹ ہوتی ہیں، جہاں ہر آنے جانے والے شخص کا کارڈ چیک کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے، کس مقصد کے تحت آیا ہے اور کہاں جارہا ہے۔ اس کے بعد رجسٹر میں اس شخص کے متعلق تمام ضروری تفصیلات درج کی جاتی ہیں کہ وہ کس وقت آیا تھا اور کس وقت گیا۔ اگر وہ کسی گاڑی میں آتا ہے تو اس کا نمبر بھی درج کر لیا جاتا ہے۔

اب حکومتِ پاکستان بھی اپنے ان ممالک کی فسطائی حکومتوں کے تجربات سے استفادہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ سائنٹیفک دور ہے، اس لئے اس دور میں سائنٹیفک لوگ سائنٹیفک طریقے اختیار کرتے ہیں۔ پولیس کو بھی جدید ہتھیاروں سے لیس کیا جا رہا ہے۔ امریکی طرز کی گاڑیاں پولیس والوں کی تحویل میں آچکی ہیں۔ مظاہرین کو روکنے کے لئے ان کے پاس نئے قسم کے ہتھیار آگئے ہیں۔ تیز رفتار گاڑیاں چشم زدن میں انھیں منتشر کر سکتی ہیں۔ ڈی آئی جی سندھ پولیس اور ک ز ئی نے یہ انکشاف کیا ہے کہ اب پولیس کے دستے ۲۴ گھنٹے کراچی سے سکھر تک گشت لگائیں گے اور "مشتبہ" افراد کی سرگرمیوں کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ کراچی میں رات ۹ بجے کے بعد رائفل بردار سپاہی گشت لگاتے پھرتے ہیں، خاص طور پر شہر سے باہر جانے والے راستوں پر لوگوں کو روک کر انتہائی بدتمیزی کے ساتھ پوچھ گچھ کرتے ہیں، اور انھیں دیر تک پریشان کرتے ہیں۔ کار والوں سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوتی زیادہ تر کشتے اور ٹیکسیوں میں بیٹھے ہوئے مسافر ان کا نشانہ بنتے ہیں۔ اگر کوئی بدحال شخص نظر آیا تو پھنس گیا۔ یہ پولیس والے "مشتبہ" افراد کو نیچے اتار کر ان کی تلاشی لیتے ہیں۔ بدتمیزی سے بات کرنا ان کا وطیرہ ہے۔ کوئی شخص احتجاج کرتا ہے تو اسے گالیاں بھی دی جاتی ہیں۔ اگر کوئی غریب شخص پھنس گیا تو اسے دو چار تھپڑ بھی جڑ دیئے جاتے ہیں۔ بارہ بجے کے بعد جو گاڑیاں آتی ہیں، انھیں لائن میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ باری باری چیکنگ کی جاتی ہے۔ خواہ مسافروں کو کوئی ضروری کام ہی کیوں نہ ہو، انھیں بیس پچیس منٹ لائن میں کھڑا رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

ہمارے ملک کی پولیس کا کردار سب پر واضح ہے۔ وہ اپنے اختیارات کو کس طرح استعمال کرتی ہے، اس کا علم سب کو ہے۔ اب اسی پولیس کو شناختی کارڈ چیک کرنے کی ذمہ داری سونپی جائے گی۔ کہا یہ گیا کہ شناختی کارڈ جاری ہونے کے بعد جرائم ختم ہو جائیں گے، اور غیر ملکیوں کی نقل و حرکت پر بھی پابندی لگائی جاسکے گی۔ یہ دعوٰے بھی کیا گیا ہے کہ شناختی کارڈوں کے اجراء کے بعد راشن کارڈ اور پاسپورٹ کا نظام بہتر ہو جائے گا۔ درحقیقت یہ جواز اصل مقصد کو چھپانے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ شناختی کارڈوں کی اسکیم کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ مخالف سیاسی جماعتوں کو آزادی کے ساتھ اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کا موقع نہ ملے۔ سیاسی کارکن دوسرے شہروں میں جا کر لوگوں کے سامنے اپنا موقف نہ پیش کر سکیں۔ ابتدائی علامات ابھی سے سامنے آگئی ہیں۔ شہر شہر مخالف سیاسی جماعتوں کے کارکنوں پر مذموم الزامات لگا کر جیلوں میں ٹھونسا جا رہا ہے۔ مختار رانا سے لے کر محمود نواز بابر تک ہر تنقید کرنے والا سرکار کی نظر میں موردِ الزام ہے۔ مختار رانا قتل کے الزام میں بند ہے تو محمود نواز بابر پر آٹھ مقدمے بنائے گئے ہیں۔ اغوا، چوری، مجرمانہ حملہ، ہر قسم کے جرائم اس کے حساب میں درج ہیں۔ اس کے ایک مقدمے میں مجرم کا حلیہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ٹھگنے قد کا ہے اور اس کے دانت سونے کے ہیں، جب کہ محمود نواز بابر لمبا چوڑا آدمی ہے، اور اس کے تمام دانت اصلی ہیں۔ لانڈھی کورنگی کی ہڑتال کے بعد جن مزدوروں کو گرفتار کیا گیا ہے، ان میں سے بیشتر پر سماجی جرائم کے الزامات عائد کئے گئے ہیں۔ اغوا ڈاکہ زنی، قتل، دھوکہ دہی، عصمت دری، دنگا فساد، غنڈہ گردی نقصِ امن، غرضیکہ کوئی جرم ایسا نہیں جو ان کے "نامۂ اعمال" میں نہیں لکھا گیا۔ مزدوروں اور سیاسی کارکنوں کو جس دھاندلی کے ساتھ تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے، اس کے پیشِ نظر یہ اندازہ غلط نہیں ہے کہ شناختی کارڈوں کی اسکیم ان پر پابندیاں عاید کرنے کے لئے مرتب کی گئی ہے۔ حکومت کی پالیسی واضح طور پر عوام دشمنی کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ محنت کشوں کے خلاف ظلم

پیر علی محمد راشدی خوشامد کے میدان میں ریکارڈ ہولڈر ہیں

کی ترکش کا ہر تیر استعمال کیا جا رہا ہے۔

پیپلز پارٹی کے لیڈروں نے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہر شخص کو تنقید کرنے کا حق دے گی۔ عوام کو سماجی آزادیاں حاصل ہوں گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج بھی شہر شہر دفعہ ۱۴۴ لگی ہوئی ہے۔ البتہ اگر کسی وزیر کو تقریر کرنی ہوتی ہے تو دفعہ ۱۴۴ اٹھالی جاتی ہے۔ یہ وہی طریقہ ہے جو پچھلے شہریاروں نے اختیار کر رکھا تھا۔ اب تک کراچی میں دفعہ ۱۴۴ لگی ہوئی ہے، لیکن چونکہ صدر بھٹو ۳ جنوری کو نشتر پارک میں ایک جلسہ سے خطاب کر رہے ہیں، اس لئے ۲ جنوری کو دفعہ ۱۴۴ اٹھالی گئی۔ یہ اقدام اس بات کی علامت ہے کہ آج بھی خواص کو آزادی حاصل ہے اور عوام قدم قدم پا بہ زنجیر ہیں۔ تمام آزادیاں، تمام دھاندلیاں مراعات یافتہ طبقے کو حاصل ہیں عام لوگوں کے لئے جیلیں اور لاٹھیاں ہیں، آنسو گیس اور دفعہ ۱۴۴ ہے۔

شناختی کارڈوں کی اسکیم کے لئے یہ جواز پیش کیا گیا کہ اس طرح غیر ملکیوں کی نقل و حرکت پر پابندی لگانے میں آسانی رہے گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہماری سرحدی پولیس کیا کر رہی ہے۔ اس کی موجودگی میں مشتبہ عناصر ہمارے وطن میں کیسے گھستے ہیں۔ اب تک اس پولیس نے کتنے مشتبہ افراد کو پکڑا؟

ایک اور جواز یہ پیش کیا گیا ہے کہ شناختی کارڈ جاری ہونے کے بعد بوگس راشن کارڈوں کی چیکنگ میں آسانی ہوگی۔ اشیائے صرف کی قلت کو روکنے کے لئے غریبوں کے راشن کارڈ چیک کرنا ضروری نہیں بلکہ امیروں کے گوداموں میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ کمزوروں کے گلے پر ہاتھ ڈالنا آسان ہوتا ہے۔ امیروں کو پکڑو جو اندھا دھند ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کر رہے ہیں۔ غریب ایک چھٹانک آٹا زیادہ لے لیتا ہے تو نوکر شاہی کے ایوانوں میں تہلکہ مچ جاتا ہے۔ امیر لاکھوں ٹن اناج اپنے گوداموں میں چھپائے رکھتے ہیں تو ان سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔ ملک کے اقتصادی نظام کو بہتر بنانا ہے تو اسمگلنگ کو کیوں نہیں روکا جاتا۔ روزانہ لاکھوں روپے کی مالیت کا سامان اسمگل کیا جا رہا ہے۔ بازاروں میں ممنوعہ غیر ملکی اشیاء کی بھرمار ہے۔ جگہ جگہ ایسے بازار کھلے ہوئے ہیں، جہاں اسمگل شدہ چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ اس طرف دیکھتے وقت اربابِ اقتدار کی بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔

ایک جواز یہ ہے کہ اس اسکیم پر عملدرآمد ہونے سے سماجی جرائم ختم ہو جائیں گے۔ یہ تصور بالکل غلط ہے۔ سماجی جرائم کی اصل وجہ اقتصادی بدحالی ہے۔ کاغذ کے یہ ٹکڑے سماجی جرائم کی رفتار پر زیادہ اثر نہیں ڈال سکتے۔ جب تک لوگ اقتصادی طور پر بدحال ہیں، اس وقت تک جرائم میں کمی نہیں آئے گی۔ کوئی شخص شوقیہ چوری نہیں کرتا۔ معاشی الجھنیں اسے جرم کی طرف لے جاتی ہیں۔ لوگوں کے معاشی مسئل حل ہو جائیں گے تو جرائم کا وجود بھی مٹ جائے گا۔ چین کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہاں لوگوں کو معاشی پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، اس لئے سماجی جرائم نظر نہیں آتے۔ شناختی کارڈ جاری کر کے جرائم کو ختم کرنے کا تصور بالکل احمقانہ ہے۔ ہر شہر اور ہر قصبے کے تھانوں میں عادی اور پیشہ ور مجرموں کا ریکارڈ موجود ہے۔ دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں، لیکن پولیس مجرموں کو [illegible] نے میں ناکام رہتی ہے۔ اکثر پولیس خود عادی مجرموں کو جرم کی [illegible] رشوت دو اور چھوٹ جاؤ [illegible] زندگی کے ہر شعبے میں اسی اصول پر عمل ہو رہا ہے۔ شناختی کارڈ جاری ہونے کے بعد مجرموں کو پکڑنے میں آسانی ہوگی۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رشوت کے دروازے تو کھلے ہوئے ہیں۔

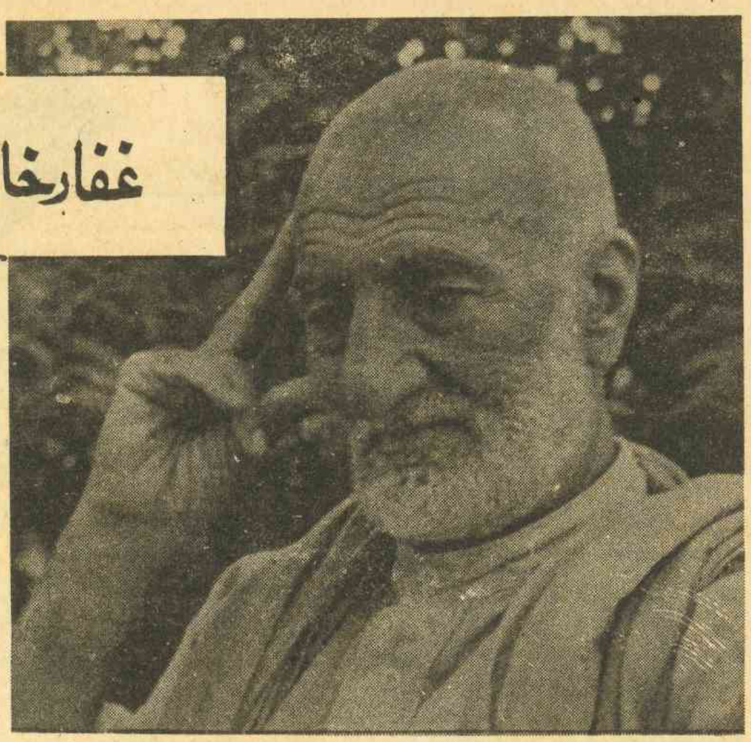
سماجی جرائم کو ختم کرنے کے لئے بنیادی اقدامات کو نظر انداز کر کے ایک جزوی اقدام، شناختی کارڈوں کا اجراء، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کا مقصد کچھ اور ہے۔ ہماری پولیس سیاسی کارکنوں کو گرفتار کرنے میں تو بہت سرگرمی دکھاتی ہے، لیکن عادی اور پیشہ ور مجرم اس کی آنکھ سے اوجھل رہتے ہیں۔ شناختی کارڈ جاری کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ سیاسی کارکنوں کو پکڑنے میں سرگرمی کا مظاہرہ کیا جائے۔ سماجی آزادیاں چھیننے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ لوگوں کے ذہنوں پر ہر وقت پولیس کا تصور چھایا رہے گا۔ اور حکومت کا مقصد بھی یہ ہے کہ سیاسی کارکن خوف زدہ ہو کر اپنی سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔ ایک ایسے وقت جب کہ ہمارے ملک میں [illegible] طرز کے جمہوری ادارے کسی حد تک بننا شروع ہو گئے ہیں [illegible] سماجی حقوق کو کچلنا، قوم کے مستقبل اور اس کے تاریخی ارتقاء کے لئے بہت خطرناک ہوگا۔ ہم شناختی کارڈوں کی اس اسکیم کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ عوام کے شعور کو کاغذی زنجیروں میں نہیں باندھا جا سکتا۔ خواہ کیسا ہی تشدد آمیز قانون بنایا جائے۔ کیسی ہی سخت پابندی لگائی جائے، عوام کے جذبۂ آزادی کو نہیں کچلا جا سکتا۔

ایک کرم خوردہ سیاسی اور صحافتی مسخرے علی محمد راشدی نے شناختی کارڈوں کی اسکیم کا خیر مقدم کرتے ہوئے، بڑی عیاری کیساتھ یہ لکھا ہے کہ چین میں بھی اس اسکیم پر عمل درآمد ہوتا ہے اور وہاں لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی آزادی نہیں ہے۔ یہ وہی پیر علی محمد راشدی ہیں، جنہوں نے صدر بھٹو کے دوروں کو صدر ماؤزے تنگ کے لانگ مارچ سے عظیم تر قرار دے کر چاپلوسی اور خوشامد کی تاریخ میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اور اب انہوں نے چین کے خلاف ایک اور شوشہ چھوڑا ہے۔ یہ بھی اچھی بات ہے کہ یہ بات علی محمد راشدی نے لکھی ہے، جن کی عیارانہ تحریروں اور خوشامدانہ اور موقع پرستانہ انداز بیان نے انہیں عوام میں ننگا کر دیا ہے۔ خوشامد سیکھنی ہو تو کوئی ان سے سیکھے۔

حقیقت یہ ہے کہ چین میں شہریوں کو تمام سماجی حقوق حاصل ہیں۔ وہ ایک ایسا ملک ہے، جس کے باشندے خود اپنی تقدیر بناتے ہیں۔ ان پر فیصلے اوپر سے مسلط نہیں کئے جاتے۔ ان کا سیاسی شعور اتنا بلند ہو گیا ہے کہ کوئی بھی طاقت انہیں ان کے سماجی حقوق سے محروم نہیں کر سکتی۔ لوگوں کو سوشلسٹ نظام سے متنفر کرنے کے لئے رجعت پسند طبقے جان بوجھ کر اس قسم کی افواہیں پھیلاتے ہیں۔ انہیں اس مقصد کے لئے سامراجی ممالک سے بڑی بڑی رقمیں ملتی ہیں اور وہ بڑی سرگرمی کیساتھ سوشلسٹ نظام کے [illegible] زہر اگلتے ہیں۔ ہم چین سے دوستی کے دعویدار ہیں، لیکن ہمارے یہاں ایسے جعل سازوں کی پرورش کی جاتی ہے جو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت چین کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔

چین کے عوام سیاسی طور پر اتنے باشعور ہیں کہ اگر آج انہیں ان کے سیاسی اور سماجی حقوق سے محروم کرنے کی کوشش کی جائے تو کل ہی حکومت کا تختہ الٹ جائے۔

غفار خان، پاکستان کے حامی یا مخالف؟



وہ بنگال اور پنجاب کو ناقابل تقسیم سمجھتے تھے

وہاب صِدّیقی

خدائی خدمت گار تحریک کے سربراہ خان عبدالغفار خان، ۲۴ دسمبر ۱۹۷۲ء کو تقریباً آٹھ سال کی خود اختیاری، جلاوطنی کے بعد افغانستان سے اپنے وطن واپس آگئے۔ اسی دن پشاور کے جلسۂ عام میں انہوں نے صدر بھٹو کو اپنے مشروط تعاون کی پیش کش کی، انہوں نے کہا کہ اگر صدر بھٹو پاکستان میں ایک نیا، ترقی پسند اور خوش حال معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو میں اُن کی مکمل حمایت کروں گا، خواہ کوئی اور ان کی حمایت نہ کرے، غفار خان نے ان الزامات کی تردید کی، جو مخالفین کی جانب سے ان پر لگائے جاتے ہیں۔

خان عبدالغفار خان، جنہیں سرحد کے عوام باچا خان، اور مخالفین "سرحدی گاندھی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ متنازعہ شخصیت ہیں، بعض افراد باچا خان کو جنگ آزادی کا ہیرو، سامراج دشمن اور قوم پرست سمجھتے ہیں۔ اور کچھ انہیں "وطن دشمن" اور "غدار" کے خطاب سے نوازتے ہیں۔

وطنِ عزیز میں یہ عجیب روایت رہی ہے کہ جس نے بھی اختلاف کیا، اور ہاں میں ہاں نہیں ملائی۔ اس پر وطن دشمنی اور غداری کا فتویٰ داغ دیا۔ حسین شہید سہروردی نے ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ کی قیادت اور مرکزی حکومت سے اختلاف کیا، تو اُن پر بھارت نوازی، پاکستان دشمنی کا الزام لگایا گیا۔ قومی اسمبلی کی رکنیت سے محروم کر دیا گیا۔ لیکن دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ جب حسین شہید سہروردی کو قلم دان وزارت عظمیٰ سونپا گیا۔ تو ان کے استقبال میں وہ افراد پیش پیش تھے، جو سہروردی کو بھارتی ایجنٹ اور پاکستان دشمن کہتے تھے۔ وزیراعظم بننے کے بعد سہروردی ان کے نزدیک سب سے بڑا محبِ وطن بن گیا تھا۔ قیام پاکستان کی جدوجہد میں شیرِ بنگال مولوی فضل الحق کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں، قرار دار پاکستان کے محرک بھی وہی تھے، تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کی مرکزی حکومت اور فضل الحق کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ فضل الحق نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کی، بعد میں مشرقی پاکستان کے انتخابات میں جگتو فرنٹ کی کامیابی کے بعد مشرقی بازو کے وزیرِاعلیٰ بنے، لیکن مرکزی حکومت کو اِن کا اقتدار ایک آنکھ نہ بھایا۔ انہیں "غدار" اور "بھارتی ایجنٹ" کا خطاب دے کر ان کی کابینہ توڑ دی اور انہیں پابند سلاسل کر دیا گیا۔ یہ تو ان دو رہنماؤں کا ذکر ہے، جو کسی زمانے میں مسلم لیگ کے صفِ اول کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے،

لیکن غفار خان اور ان کے برادرِ بزرگ ڈاکٹر خاں صاحب کا مسئلہ مختلف ہے دونوں بھائی کانگریس کے سرکردہ رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے، قیام پاکستان کے بعد دونوں پر مسلم لیگ کا عتاب نازل ہوا۔ جیل میں ڈال دیئے گئے، غفار خان تو اپنے نظریات پر قائم رہے۔ لیکن ڈاکٹر خاں صاحب نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ برسراقتدار طبقے کی وفاداری کا حلف اٹھایا اور راتوں رات ون یونٹ کے پہلے وزیراعلیٰ بن گئے۔ موصوف کی کابینہ میں ایسے مسلم لیگی وزیروں کی اکثریت تھی، جو ایک دن پہلے انہیں "کانگریسی"، "بھارت نواز" اور "ملک دشمن" کہتے تھے۔

غفار خاں پر کانگریس نوازی، تحریک پاکستان کی مخالفت کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ اور سب سے سنگین الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ خود مختار آزاد پختونستان کی تحریک کے بانی ہیں۔ ان الزامات کی وجہ سے انہیں کئی مرتبہ پابند سلاسل کیا گیا، ۶ ستمبر ۱۹۵۶ء کو غفار خان نے مغربی پاکستان کی عدالت عالیہ میں ایک تحریری بیان پیش کیا، جس میں ان الزامات کی تردید اور اپنے موقف کی وضاحت کی، اِس تحریری بیان میں کانگریس سے اتحاد کی وجہ یہ بتائی کہ ۱۹۳۰ء میں برطانوی حکومت سرحد کے عوام پر انسانیت سوز مظالم کر رہی تھی۔ ہم نے مسلم لیگ کے قائدین کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اور امداد چاہی لیکن مسلم لیگ کے رہنما انگریزوں سے لڑائی چھیڑنے کے حق میں نہیں تھے، اس لئے وہ امداد دینے پر رضامند نہیں ہوئے۔ کانگریس نے اِس شرط پر خدائی خدمت گاروں کی حمایت کرنے کی پیش کش کی کہ وہ کانگریس کا ساتھ دیں۔ چنانچہ خدائی خدمت گاروں کو حالات کی نزاکت کے پیش نظر کانگریس سے اتحاد رکھنا پڑا۔

قیامِ پاکستان کی مخالفت کے الزام کی تردید کرتے ہوئے غفار خاں نے اپنے تحریری بیان میں کہا کہ انہوں نے نظریۂ پاکستان کی کبھی مخالفت نہیں کی، لیکن ان کے نزدیک پاکستان کا تصور دوسرا تھا، وہ بنگال اور پنجاب کو ناقابلِ تقسیم سمجھتے تھے۔ وہ مسلمان رہنماؤں کی اکثریت کو انگریزوں کا پٹھو سمجھتے تھے، اور ان کے خیال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی لڑائی مذہبی نہیں بلکہ اقتصادی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ہندوستانی فیڈریشن کی حمایت اس شرط پر کی تھی کہ ہندوستان کی آئندہ حکومت سوشلسٹ ری پبلک ہو۔

پختونستان کے بارے میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جس طرح پنجاب، بنگال، سندھ اور بلوچستان پاکستان کے صوبوں کے نام ہیں، اسی طرح پختونستان بھی پاکستان کے ڈھانچے کے اندر ایک نام ہے۔ انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں پٹھانوں کے علاقہ کا نام تک مٹا دیا۔ اس ناانصافی کا ازالہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جن علاقوں میں پشتون بستے ہیں، انھیں

ایک نام دیا جائے۔ تاکہ وہ متحد ہوسکیں۔

غفار خان، برصغیر ہند و پاکستان کو ناقابلِ تقسیم سمجھتے تھے، کانگریس کا ساتھ بھی انھوں نے اسی نظریہ کے تحت دیا۔ چنانچہ جب کانگریس نے تقسیمِ ہند کی قرارداد منظور کی، تو وہ دنگ رہ گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب "انڈیا ونیز فریڈم" میں لکھتے ہیں کہ جب مہاتما گاندھی نے کانگریس کے اجلاس میں تقسیمِ ہند کی حمایت کی تو غفار خان دنگ رہ گئے۔ انھوں نے کھڑے ہوکر احتجاجاً کہا۔

"ہم نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا۔ آج ہمیں
بھیڑیوں کے رحم و کرم پر چھوڑا جارہا ہے۔ یہ
بھیڑیے ہمیں کھا جائیں گے ——— "

بہرحال جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت سرحد میں کانگریس کی حکومت تھی۔ غفار خان کے برادر بزرگ ڈاکٹر خان صاحب وزیرِ اعلیٰ تھے۔ انہوں نے پاکستانی پرچم کو سلامی نہیں دی۔ تو قائدِ اعظم کے حکم پر گورنر سرحد سر جارج کنگھم نے ڈاکٹر خان صاحب کو ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو برخاست کردیا۔ اور خان قیوم سرحد کے وزیرِ اعلیٰ بنائے گئے۔ خان قیوم کی غفار خاں سے پرانی لگتی تھی۔ کیونکہ خان قیوم بھی کسی زمانے میں کانگریس میں تھے اور مرکزی قانون ساز اسمبلی میں کانگریس کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ وہ ایک طویل عرصہ تک کانگریس کا حق نمک ادا کرتے رہے تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں "گولڈ اینڈ گنز" نامی کتاب لکھی اور جب یہ دیکھا کہ پاکستان ناگزیر ہوگیا ہے تو مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ تاکہ مسندِ اقتدار تک رسائی ہوجائے، قیوم خان نے وزیرِ اعلیٰ بنتے ہی اپنے سیاسی مخالفین کو پاکستان دشمن قرار دے کر کچلنے کا منصوبہ بنایا۔ گورنر سرحد سر جارج کنگھم کو جب اس منصوبے کا علم ہوا تو انھوں نے قائدِ اعظم کو لکھا کہ سرحد کے عوام اور خدائی خدمت گار پاکستان کے نہایت وفادار ہیں۔ غفار خان اس حیثیت میں نہیں کہ ملک کے خلاف کوئی اقدام کرسکیں۔ لیکن وہ خدائی خدمتگاروں میں مقبول ہیں۔ اگر انھیں گرفتار کیا گیا یا کوئی دوسری کارروائی کی گئی تو عوام میں حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہوجائے گی۔ اس لئے غفار خان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ قائدِ اعظم نے گورنر سرحد کے مشورے سے اتفاق کرتے ہوئے قیوم خان کو ہدایت کی کہ وہ غفار خان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں۔ لیکن قیوم خان نے اس ہدایت کو نظرانداز کردیا۔ اور غفار خاں، ڈاکٹر خان صاحب قاضی عطاء اللہ خان اور دیگر رہنماؤں کو گرفتار کرلیا۔

ان گرفتاریوں کے خلاف خدائی خدمت گاروں نے بابڑہ کے میدان میں جلسہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ خان قیوم کے حکم پر بابڑہ کے میدان میں جلیانوالہ باغ کی تاریخ دہرائی گئی۔ پولیس نے اجتماع کو

سورج کی کہانی

عام شہری کہاں جائیں؟

اسمگلروں اور ذخیرہ اندوزوں کی پرورش کی جارہی ہے

مہنگائی کا بھوت اپنے بدنما دانت نکالے زور زور سے قہقہے لگا رہا ہے۔ غریب عوام خوف سے پتے کی طرح تھر تھر کانپ رہے ہیں کوئی شخص یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کل اسے پیٹ بھر کر کھانا مل سکے گا یا نہیں۔ متوسط طبقے کے لوگ بھی گرانی کے سامنے بے بس نظر آرہے ہیں۔ روپے کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ آج پانچ سو روپیہ ماہوار پانے والا ملازم کل کے سو روپیہ ماہوار پانے والے ملازم سے بھی زیادہ بے چین نظر آتا ہے۔ بازار جاکر اشیاء کی قیمتیں پوچھو تو دل دھک سے ہوکر رہ جاتا ہے۔ گھریلو عورتیں اس کرب کا شکار ہیں کہ بڑھتی ہوئی گرانی کے دور میں وہ اپنے گھروں کا خرچ کس طرح چلائیں۔ ساری رقم تو اشیائے خوردنی کی مد میں صرف ہوجاتی ہے، دوسری ضروریات کے لئے پیسہ کہاں سے آئے۔

غریب چپراسی اپنے بچے کے زرد اور بے رونق چہرے کی طرف دیکھتا ہے، تو اسکی آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں۔ ہمارا جرم کیا ہے؟ تنخواہ میں چند روپوں کا اضافہ ہوا تھا، لیکن اشیائے صرف کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہوچکا ہے۔ تنخواہوں میں اضافہ ڈھونگ تھا۔ روٹی، کپڑا، مکان فراہم کرنے کا وعدہ جھوٹا تھا۔ حالات پہلے سے بھی بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ میرے بچے کو دودھ نہیں ملتا، لیکن صاحب لوگوں کے کتوں کو مل جاتا ہے۔

ایوب خان کے زمانے میں آٹا بیس روپے من تھا، تو حبیب جالب چیخ اٹھا تھا،

بیس روپیہ من آٹا، اس پر بھی ہے سناٹا

لیکن آج آٹا تیس روپیہ من ہوگیا ہے۔ ہر چہرے پر خوف کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ ہر لمحہ صدیوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ لیکن جو لوگ کل تک سونے چاندی میں تلتے تھے، وہ آج بھی زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ مہنگائی کا بوجھ صرف غریب برداشت کرتے ہیں۔ امیروں کے گھر میں تو دولت کی ریل پیل ہے، کاریں ہیں، کوٹھیاں ہیں، ڈنر پارٹیاں ہیں، رنگ رلیاں ہیں، قہقہے ہیں۔ غریبوں کے گھروں میں صرف آنسو اور سسکیاں ہیں۔

مہنگائی بڑھتی جارہی ہے اور اربابِ اقتدار زندگی کے اس سب سے اہم مسئلے کو حل کرنے کے لئے کوئی مؤثر اقدام اٹھانے

تو گرانی کا کوئی احساس نہیں ہوتا کیونکہ ان کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ انھیں ہر چیز آسانی سے فراہم ہوجاتی ہے۔ پیاس کی شدت کا احساس صرف پیاسے ہی کو ہوسکتا ہے۔

گرانی کا جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ملک گذشتہ جنگ کی شکست کے بعد اقتصادی طور پر بدحال ہوچکا ہے، اور اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں وقت لگے گا۔ لیکن گرانی کا سبب صرف یہ نہیں ہے۔ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، رشوت ستانی اور اسمگلنگ کا زور پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اگر گرانی کا خاتمہ کرنا ہے، اگر بیماری کو جڑ سے ختم کرنا ہے، تو ان بنیادی بدعنوانیوں کا خاتمہ کیا جانا چاہیئے۔ کرنسی کا پھیلاؤ بڑھتا جارہا ہے۔ ہٹلر کے زمانے میں بوری بھر نوٹ کے بدلے ایک سیر آلو بھی نہیں مل سکتے تھے۔ اگر کرنسی کے پھیلاؤ پر قابو نہ پایا گیا تو ہمارے ملک کا بھی یہی حشر ہوگا۔ کرنسی کے پھیلاؤ کی ایک بہت بڑی وجہ اسمگلنگ ہے۔ اسمگلنگ کا زور بڑھ رہا ہے اور اربابِ اقتدار خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ بازاروں میں اسمگل شدہ اشیاء کی بھرمار ہے۔ جو چاہے خرید لو۔ اسمگلر کھلے بندوں یہ اعلان کررہے ہیں کہ وہ اپنا دھندا بند نہیں کریں گے۔ آخر وہ اپنا دھندا کیسے بند کریں۔ پیپلز پارٹی میں معروف اسمگلر برسرِ اقتدار ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے بعض وزارت کے عہدے تک جا پہنچے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ماضی میں اسمگلنگ کے جرم میں مقدمات چل چکے ہیں۔ پیپلز پارٹی کی حکومت میں بعض ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو کل تک پانچ پانچ روپے کے لئے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے تھے، لیکن آج وہ پانچ پانچ لاکھ روپے کی جائدادوں کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ برسرِ اقتدار طبقہ دونوں ہاتھوں سے دولت کما رہا ہے۔ اسمگلروں کی پرورش کی جارہی ہے۔ ان حالات میں عوام کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے کہ برسرِ اقتدار افراد کے اثاثوں کا اعلان کیا جائے اور ایک غیر جانبدار عدالت کے ذریعے انکی تحقیقات کرائی جائے۔

گرانی اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتی جب تک کہ

باقی صفحہ [illegible] پر ملاحظہ فرمائیں

پردہ چاک

اندرونِ سندھ کے صارفین ٹی وی سیٹ توڑ رہے ہیں



ٹیلیویژن کارپوریشن کو

۳۰ لاکھ روپے سالانہ نقصان

نعیم الحسن

اگلے وقتوں میں برطانوی سامراج کے خطاب یافتہ وظیفہ خوار، جاگیر دار اور خان بہادر اپنی امارت کا بھرم قائم رکھنے کے لئے طرح طرح کی حرکتیں کرتے تھے۔ برصغیر پاک و ہند سے جب برطانیہ نے اپنا بستر گول کیا تو ان وظیفہ خواروں کی اقتصادی حالت بگڑ گئی، کروفر اور شان و شوکت جاتی رہی، سود خور بنیوں کے کھاتوں میں ان کی ساری جائدادیں منتقل ہوگئیں، مگر ان بگڑے نوابوں نے اپنی مونچھ اونچی رکھنے کے لئے ڈیوڑھی کے باہر کھڑے ہوئے ہاتھیوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا۔ کیونکہ یہ جھومنے والے ہاتھی ان کی رہی سہی عزت، غرور، اور تمکنت کا آخری نشان تھے۔ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ بگڑے نواب، جاگیر دار اور قلاش خان بہادر اپنے ہاتھوں سے اپنی عزت کی تابوت میں کیل ٹھونک دیتے۔

ایوب خان بگڑے نواب تو نہیں تھے۔ البتہ آمر ضرور تھے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے لکھنو کے نوابوں کی طرح حرکتیں کرتے تھے۔ ان کے مشاغل جدید تھے۔ موصوف نے اپنے کارناموں کی تشہیر اور پروپیگنڈے کے لئے ٹیلی ویژن کے نام سے ایک سفید ہاتھی پاکستان کے دروازے پر باندھ دیا۔ سرکاری سطح سے یہ تاثر دیا گیا کہ ملک کی مضبوط معیشت اور خوش حالی کے پیش نظر "عوامی تفریح" کا انتظام کیا گیا ہے۔ چند سالوں میں گھر گھر ٹیلیویژن پہنچا دیا جائے گا۔ بیچارے عوام کبھی اس خبر کو سنتے اور کبھی اپنے گھروں میں ٹھنڈے چولہے اور اوندھی ہوئی ہانڈیوں کو دیکھتے۔ روٹی نہیں ملی تو کیا ہوا۔ ٹیلی ویژن کی ملکیت کا پیغام تو مل گیا۔

ایوب خاں کے جانشین بھی اپنے بھرم کو قائم رکھنے کیلئے وہی کچھ کرتے رہے جو ان کا پیشرو کرتا رہا۔ ٹیلی ویژن کی شکل میں سفید ہاتھی گھر کے دروازے پر ابھی تک بیٹھے کے قرض پر پل رہا۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے اب تک سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی میدان میں جو قابل ذکر ترقیاں کی ہیں، ان کی سرعام نفی کر دی جائے۔

پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کو سالانہ ۳۰ لاکھ روپے کا خسارہ ہو رہا ہے۔ جبکہ ٹیلی ویژن کو کاروباری اشتہارات اور دیگر پروپیگنڈے کے عوض ہر ماہ لاکھوں روپے وصول ہوتے ہیں آخر کارپوریشن کو ہر ماہ اتنی کثیر رقم کا نقصان کیوں ہوتا ہے، اگر ان کی وجوہ پر غور کیا جائے تو اس سفید ہاتھی کے رکھوالوں کی بگڑی ہوئی عادتوں اور بدعنوانیوں کے طرح طرح کے قصے منظر عام پر آئیں گے۔ یہ اناڑی "فیل پان" اپنے جاہلانہ تجربات اور ناکارہ پروگراموں پر ہزاروں لاکھوں روپے خرچ کر کے سامعین کا وقت برباد کرتے ہیں۔

۲۲ دسمبر ۱۹۷۲ء کو پاکستان میں ٹیلی ویژن پر ایڈیلیڈ میں ہونے والے پاکستان اور اسٹریلیا کے درمیان پہلا کرکٹ ٹیسٹ میچ دکھایا گیا۔ یہ میچ بحر ہند کے ایک مواصلاتی سیارے کے ذریعے براہ راست ایڈیلیڈ سے صبح ساڑھے گیارہ بجے تک ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔ قریبی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس چوچلے پر اسی ہزار کی خطیر رقم خرچ کی گئی۔ صرف ایک گھنٹے کے پروگرام وہ بھی کرکٹ میچ کی ایک جھلک پر اسی روپے کے اخراجات کی عیاشی کیا پاکستان جیسے غریب اور پس ماندہ ملک کو زیب دیتا ہے؟ یہی نہیں، ٹی وی کراچی کے جنرل منیجر کنور آفتاب اور پروگرام منیجر عشرت انصاری نے بطور خاص اس ذلیل پروگرام کا اہتمام کیا ٹیلی کاسٹ کے دوران "اس عظیم کامیابی" پر ان کی باچھیں بار بار کھل جاتی تھیں۔ اگر یہ دونوں حضرات اس معاملے پر قومی جذبے کے تحت کچھ سوچتے تو شائد وہ ایک گھنٹے کی اس بوگس تفریح پر کبھی اسی ہزار خرچ نہ کرتے، بلکہ اس تجویز کو قبل از وقت مسترد کر دیتے۔ شائد وہ اس پروگرام کو ٹیلی کاسٹ کر کے "اس عظیم کارنامے" کا سہرا اپنے سر باندھ کر ٹیلی ویژن کی تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف میں لکھوانا چاہتے تھے، کیا ٹیلی ویژن کے حکام اور اعلیٰ افسران قوم کو یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے اس پروگرام پر اتنی بڑی رقم کس کے اشارے پر خرچ کی گئی۔؟ اس پروگرام کو کس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے پیش کیا گیا کرکٹ ہمارا قومی کھیل نہیں رہا، پاکستان ابھی پس ماندہ ملک ہے، اقتصادی اور سیاسی صورت حال زلزلے کی شکار ہے۔ عوام روٹی، شکر اور بناسپتی گھی کے لئے ترس رہے ہیں۔ تھرپارکر کے سیکڑوں ہزاروں بے گھر افراد بے روزگار ہیں۔ سقوط ڈھاکہ نے پاکستان کی معیشت کا کچومر نکال دیا ہے۔ ملک کے ترانوے ہزار فوجی بھارت کے جنگی کیمپوں میں وحشت اور بربریت کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ایسے کٹھن حالات میں ٹیلی ویژن کے کارپرداز کرکٹ ٹیسٹ میچ کے ایک گھنٹے کے پروگرام پر اسی ہزار روپے برباد کرنے میں معمولی سی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی نہیں کرتے۔ اگر اس پروگرام میں عوامی اصرار کا دخل ہوتا تو شائد ٹیلی ویژن کے ان بگڑے رئیسوں کی بگڑی ہوئی عادتوں اور چوچلوں پر صبر کر لیا جاتا۔ مگر یہاں تو عوامی اصرار کا دور دور تک سراغ نہیں ملتا البتہ ٹی وی کے "ابوالحسن" اپنی ہر پسند کو عوامی پسند قرار

تین لاکھ روپے سے تیار ہونے والی فلم ڈبے میں بند ہے

دے کر عوام سے زبردستی داد و تحسین وصول کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ کیا ٹیلی ویژن کے شہزادے یہ بتائیں گے کہ کرکٹ عوام کے کس طبقے میں مقبول ہے، اور کیا اس کھیل کے ایک گھنٹے کے پروگرام پر عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی اس بے دردی سے لٹانا جائز ہے۔؟

لال قلعے سے لالوکھیت کا قصّہ

ممتاز ڈرامہ نویس خواجہ معین الدین مرحوم کا ایک ڈرامہ لال قلعے سے لالوکھیت تک بہت مقبول ہوا تھا۔ اس اسٹیج ڈرامہ کی مقبولیت کے پیشِ نظر ٹی وی والوں نے اس کی فلم تیار کی۔ اس کی تیاری پر تقریباً تین لاکھ روپے خرچ کئے گئے یہ اُس زمانے کی بات ہے جب اسلم اظہر ایم ڈی نہیں بنے تھے۔ ٹیلی ویژن کے فن کاروں نے اس فلم کو سنوارنے اور نکھارنے میں شب و روز محنت کی اور مہینوں میں جاکر یہ فلم تیار ہوئی۔ فلم ڈویژن کے انچارج اور اسلم اظہر کے درمیان کسی بات پر شدید اختلافات تھے چونکہ موصوف کے پاس اتنے اختیارات نہیں تھے اس لئے وہ انچارج کا بال بیکا نہ کرسکے۔ ان کے ایم ڈی بنتے ہی فلم ڈویژن کے انچارج نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا کیونکہ وہ اس ادارے میں سب سے سینئر اور تجربہ کار تھے۔ تین لاکھ روپے سے تیار ہونے والی فلم "لال قلعے سے لالوکھیت" کو ایم ڈی جناب اسلم اظہر نے غیر معیاری قرار دے کر ڈبے میں بند کردیا۔ اس فلم کے کلر ڈاسٹلز چند ماہ پیشتر تک آغا ناصر کے کمرے میں رکھے ہوئے تھے۔ ایک پرائیویٹ پارٹی نے اس فلم کو خریدنے کا آفر دیا، مگر اسلم اظہر نے فروخت کرنے سے انکار کردیا اگر اسے فروخت کردیا جاتا تو کم از کم اس فلم پر خرچ ہونے والی رقم نکل آتی، مگر ذاتی رنجش اور پیشہ ورانہ رقابت کو اس حد تک ہوا دیا گیا کہ ایک معیاری فلم کو ڈبوں میں بند کرکے قوم کے سرمائے کو ضائع کردیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ضیاء محی الدین نے آفر دیا کہ وہ اس فلم کی خامیوں کو دور کریں گے۔ اس پر مزید ملاکھ روپے کے اخراجات کا تخمینہ لگایا گیا۔ ٹیلی ویژن کے چودھریوں نے اس پر آمادگی ظاہر کردی تھی کہ اسی درمیان پی آئی اے آرٹ اکیڈمی نے ضیاء محی الدین کی خدمات کو خرید لیا۔ اس طرح یہ فلم ابھی تک ڈبے میں بند پڑی ہے، جس پر تقریباً تین ساڑھے تین لاکھ روپے خرچ کئے جاچکے ہیں۔

ضیاء محی الدین شو

ضیاء محی الدین براڈوے اور ہالی وڈ میں گاہے بگاہے ایکسٹرا رول ادا کرتے تھے۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکے، کیونکہ ہالی وڈ ان کے "ٹیلنٹ" سے استفادہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ویسے بھی جن لوگوں نے موصوف کو ایکسٹرا رول میں دیکھا ہے۔ ان کی رائے یہی تھی کہ اس فن کار کا آغاز، انجام ہے۔ کیونکہ "آسمانِ فلم" پر چمکنے والے نوآموز فن کار کے تیور کچھ اور ہوتے ہیں جب کہ موصوف کے تیور خاصے بگڑے ہوئے ہیں۔ جب ضیاء محی الدین ناکام و نامراد پاکستان میں وارد ہوئے تو ٹی وی والوں نے انہیں غنیمت جانا اور انہیں اپنی مٹھی میں دبوچ لیا۔ اعلان کیا گیا کہ ہالی وڈ کے ممتاز پاکستانی اداکار ہر ہفتے ٹی وی پر ضیاء محی الدین شو پیش کرکے سامعین کا دل بہلائیں گے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ضیاء محی الدین شو اس تزک بھڑک اور چمک دمک کے ساتھ ٹی وی کے سامعین پر نازل ہونے لگا کہ لوگ ایک ہی ماہ میں چیخ اٹھے۔ پروگرام کے ایک شو پر ہزاروں روپے خرچ ہوتے تھے۔ اور ایک ماہ میں بات لاکھوں روپے تک پہنچتی تھی۔ اس شو کا عوامی احساسات و جذبات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ خالص براڈوے اور ہالی وڈ انداز میں ضیاء محی الدین صاحب بید مجنوں کی طرح ناچتے تھرکتے ہوئے سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا تعارف کراتے اور اپنے مخصوص انداز میں سوالات کرکے انہیں شرمندہ کرتے اور خود بھی شرمندہ ہوتے۔ ٹی وی والوں کا بس چلتا تو سارے پروگرام ختم کرکے صرف ضیاء محی الدین شو پیش کرتے، مگر اتفاق سے پاکستان کے اخبارات اور عوام نے شور مچاکر ٹی وی والوں کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ اگر اخبارات بر وقت قدم نہ اٹھاتے تو ممکن تھا ٹی وی کے سفید ہاتھی کو ہالی وڈ سے آنے والا پاکستانی فیل مست کچل کر رکھ دیتا۔

تھانہ بولا خاں میں ریلے اسٹیشن قائم کرنے کا وعدہ فراموش کردیا گیا

حکومت نے اعلان کیا تھا کہ مارچ ۷۱ء تک تھانہ بولا خاں میں ریلے اسٹیشن قائم کردی جائے گی۔ اس طرح اندرونِ سندھ کے لوگ ٹی وی کے پروگراموں کو بخوبی دیکھ سکیں گے۔ اس اعلان کا اثر یہ ہوا کہ ہزاروں افراد نے ٹی وی سیٹ خرید لئے لیکن وعدہ کے مطابق تھانہ بولا خاں میں ریلے اسٹیشن قائم نہیں کی گئی۔ جس کے نتیجے میں ہزاروں ٹی وی سیٹ بیکار ہوگئے۔ اس پر طرہ یہ کہ ٹی وی کے مالکوں کو حکم دیا گیا کہ وہ فی ٹی وی پچاس روپے لائسنس فیس ادا کریں۔ ٹی وی کے مالکان نے لائسنس فیس دینے سے انکار کردیا۔ موجودہ حکومت کی جانب سے ایک بار پھر اعلان کیا گیا کہ جولائی ۷۲ء، اور اس کے بعد ستمبر ۷۲ء تک تھانہ بولا خاں میں ریلے اسٹیشن قائم کردی جائے گی، لیکن یہ دونوں تاریخیں نکل گئیں۔ اور وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ اس وعدہ خلافی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اندرون سندھ ٹی وی کے مالکوں کو ہر ماہ ٹی وی کی فنی خرابیوں کو درست کرانے پر سینکڑوں روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ کچھ سر پھرے ایسے بھی ہیں جنھوں نے کراچی ٹی وی اسٹیشن سے نشر ہونے والے دھندلے دھندلے پروگراموں کو دیکھنے کی بجائے اپنے ٹی وی سیٹ کو توڑ پھوڑ کر برابر کردیا ہے۔

ٹی وی کے دوسرے پروگرام

ترقی پسند ممالک میں ٹی وی کے پروگراموں سے اصلاح کا کام لیا جاتا ہے۔ ایسے پروگرام پیش کئے جاتے ہیں جو قومی جذبات کی ترجمانی اور عکاسی کرتے ہیں، ترقی پسند نظریات کو پروگراموں میں پیش کیا جاتا ہے۔ نئی نسل کو قومی ورثے اور تہذیبی قدروں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ ان کے کردار کو نظریاتی طور پر پختہ کیا جاتا ہے، لیکن بدقسمتی سے جہاں پاکستان جیسے پس ماندہ ملک کو ٹی وی کی عیاشی سے روشناس کرایا گیا وہاں شروع ہی سے ایسے ناقص اور گھٹیا پروگرام پیش کئے گئے جن سے تعمیری اور اخلاقی جذبہ بیدار ہونے کی بجائے جرائم، جنسی گھٹن اور اخلاقی بیماریوں کو پوری طرح پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ ٹی وی کے پروگراموں کی تاریخ اٹھاکر دیکھ لیجئے، مشکل سے ایسے چند پروگرام ملیں گے جنھیں قومی مزاج کے مطابق قرار دیا جاسکتا ہے۔

پروگراموں میں بیشتر امریکی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ امریکہ یا یورپی ممالک تو ان فلموں کے متحمل ہوسکتے ہیں۔ لیکن پاکستان ایسی فلموں کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ مزے کی بات ہے کہ ہر ہفتے سینٹ، آئرن مین اور اسی قسم کی مار دھاڑ اور سنسنی خیز واقعات سے بھرپور فلموں کی نمائش اس اہتمام اور باقاعدگی سے کی گئی کہ کراچی اور ملک کے دوسرے شہروں کی سڑکوں پر دن دہاڑے اسی قسم کے واقعات کی ریہرسل ہونے لگی۔

ٹی وی والے اس قسم کی مہمل اور بکواس انگریزی فلموں کی خریداری پر سالانہ لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں، جبکہ ان فلموں کا پاکستانی عوام کی زندگی اور ان کے مسائل سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ٹی وی پر امریکی فلم روون اینڈ مارٹن اور اُوڈ کپل جیسی مزاحیہ فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ ان فلموں

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

کوٹری بیراج کا ایک سنگین مسئلہ



چالیس ہزار کاشتکار خاندانوں کو

بیدخلی کے نوٹس دے دیئے گئے

الفتح رپورٹ

کوٹری بیراج کے چالیس ہزار کاشتکار خاندانوں کو بے دخلی کے نوٹس دیدیئے گئے۔ آبادکاروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ۳۱ر دسمبر تک سرکاری واجبات ادا کردیں بصورت دیگر انہیں اُن کی زمینوں سے بے دخل کر دیا جائے گا ممکن ہے سرکاری واجبات کی وصولی کی مدت میں مزید توسیع کر دی جائے لیکن یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ پر رہے گی کہ ایک ایسے علاقے کے آبادکار جو سالہا سال سے خشک سالی اور دیگر مشکلات کا شکار ہیں انہیں زیادہ سے زیادہ دو ماہ کے اندر اندر واجبات کی تمام اقساط جمع کرانی ہیں۔ دوسری صورت میں انہیں انکی اراضی سے بیدخل کر دیا جائے گا جس کی مٹی میں ان کا لہو شامل ہے۔

اگر صوبائی حکومت نے اپنے اعلان کے مطابق سرکاری واجبات کی عدم ادائیگی کی صورت میں کوٹری بیراج کے دائیں کنارے کے آبادکاروں اور کاشت کاروں کی بے دخلی کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا تو سرحد، بلوچستان اور پنجاب کے تیس سے کم پینتیس ہزار کاشت کار خاندان دانے دانے کے محتاج ہو کر رہ جائیں گے اور انہیں کوٹری بیراج کو چھوڑ کر اپنے اپنے صوبوں کی جانب کوچ کرنا ہوگا۔ یہ مسئلہ مرکزی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ زمین سے محروم کئے جانے والے کاشت کاروں کا قافلہ جب اپنے صوبے میں پہنچے گا تو وہاں ان کے روزگار اور آبادکاری کا نیا اور سنگین مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا۔

بظاہر یہ مسئلہ سیدھا سادہ نظر آتا ہے کہ کوٹری بیراج کے کاشت کاروں نے گذشتہ کئی سالوں سے سرکاری واجبات کی اقساط جمع نہیں کرائیں چنانچہ صوبائی حکومت نے ۳۱ر دسمبر ۱۹۷۲ء تک واجبات کی ادائیگی کے نوٹس جاری کرتے ہوئے متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے اس ہدایت کی خلاف ورزی کی تو انہیں اراضی سے بیدخل کر دیا جائے گا۔ مگر بات صرف اتنی نہیں ہے۔ متعلقہ محکمہ کو نوٹس جاری کرنے سے قبل حقائق معلوم کرنے چاہیئے تھے کہ کاشت کاروں کی زرعی اور اقتصادی صورت حال کیسی ہے۔ وہ واجبات کی تمام رقم ۳۱ر دسمبر تک جمع کرانے کے اہل بھی ہیں۔؟ یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ کوٹری بیراج کے کاشتکاروں کے نام نوٹس جاری کرنے سے قبل ان کے حالات معلوم نہیں کئے گئے، بلکہ انتہائی بھونڈے اور ٹھیٹ جاگیردارانہ طریقہ سے ان کی بیدخلی کے نوٹس جاری کر دیئے گئے۔

ہم نے اپنے طور پر اس واقعہ سے متعلق جو معلومات حاصل کی ہیں، ان سے محکمہ زراعت، آبپاشی اور دیگر محکموں کے اعلیٰ افسران اور مختار کاروں کی کھلی ہوئی دھاندلی کا انکشاف ہوا ہے زرعی اصلاحات کے تحت حالیہ تقسیم اراضی کے دوران ڈپٹی کمشنر آفس کے اہل کاروں اور مختاروں نے دھاندلی، رشوت اور اقربا پروری کا جو بدنما اور گھناؤنا چکر چلایا ہے اس کے لئے علیحدہ سے مضمون درکار ہے، فی الوقت ہم کوٹری بیراج کے ان بدنصیب کاشت کاروں کے حالات بیان کریں گے جن کے سروں پر بے دخلی کی صورت میں بے روزگاری اور فاقہ کشی کی تلوار لٹک رہی ہے۔

کوٹری بیراج کی دائیں طرف کا علاقہ بارانی ہے، ۱۹۶۱ء سے قبل یہ حصہ ویران اور بنجر تھا ۶۲ - ۱۹۶۱ء میں اس علاقے میں سرحد، بلوچستان اور پنجاب کے کاشت کاروں کو آباد کیا گیا، جنہوں نے لگاتار محنت اور مشقت کے ذریعہ چند سالوں میں اس علاقہ کو سرسبز بنا دیا۔ لیکن قدرت اس علاقہ کے کاشت کاروں پر ہمیشہ نامہربان رہی، ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۲ء تک دو بار اس علاقے کو آفت زدہ قرار دیا گیا۔ غیر معمولی بارشوں کی وجہ سے پورا علاقہ زیر آب آگیا اور کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں دو مرتبہ خشک سالی نے کھیتوں کو ویران کیا، زمین میں دراڑیں پڑ گئیں۔ سینکڑوں مویشی ہلاک ہو گئے۔ اور کسان پھٹی پھٹی نگاہوں سے قدرت کی پھیلائی ہوئی تباہ کاریاں دیکھتے رہے خشک سالی اور قحط نے ہر چیز کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ کسانوں نے برسوں کی محنت سے جو کچھ تیار کیا تھا۔ وہ مٹی میں مل گیا۔

تقسیم اراضی کے دوران

مختار کاروں نے

ہزاروں روپے بنائے

ایوب خان کے اقتدار سے لے کر موجودہ حکومت تک متعدد بار اس علاقہ کے حقائق معلوم کرنے کے لئے رپورٹیں تیار کی گئیں، جن میں اس بات کی نشان دہی کی گئی کہ کوٹری بیراج کے مرکزی علاقہ ضلع ٹھٹھہ انتہائی پس ماندہ ہے۔ سیم وتھور اور پانی کی کمی اور دیگر قدرتی آفات کی وجہ سے اس علاقہ کی زمین بنجر ہوتی جا رہی ہے، اس صورت حال کے پیش نظر ماضی میں کاشت کاروں کو ٹیکسوں اور واجبات کی ادائیگی میں چھوٹ دینے کے علاوہ دوسری مراعات بھی دی گئیں۔

اس علاقہ کے کاشت کاروں نے بتایا کہ بیراجوں کی اراضی کو درجہ بندی کے بغیر، اچھے خاصے معاوضہ کے عوض کاشت کاروں سے فروخت کی گئی، زمین کی فروخت کے دوران کھلی کچہری میں کاشت کاروں کو یقین دلایا گیا تھا کہ یہ علاقہ زرخیز ہے۔ لیکن دس سال کی مسلسل محنت اور مشقت کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس حصے کی زمین انتہائی ناقص اور بنجر ہے، اس طرح آبادکاروں کو فریب دے کر ان سے اچھی خاصی رقم اینٹھ لی گئی۔

اس علاقہ کو کبھی ترقی دینے کی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ یہاں ہزاروں کاشت کار خاندان آباد ہیں۔ سڑکوں کے بغیر کاشتکاروں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان سے محکمہ زراعت اور محکمہ انہار کے کرتا دھرتا ناواقف نہ ہوں گے۔ اسکول، ہسپتال اور

پوسٹ آفس کے لئے یہ علاقہ ہمیشہ تر ستا رہا، مگر نوکر شاہی کو کاشتکاروں کی ان مشکلات سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ انتہا تو یہ ہے کہ بارانی علاقہ کے کاشت کاروں کو سات ماہ تک پانی سے محروم رکھا گیا۔

کوٹری بیراج کے اس علاقہ میں زیادہ تر گنے کی پیداوار ہوتی ہے۔ تحقیقاتی کمیٹیوں نے اپنی رپورٹ میں اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بار بار تجویز پیش کی کہ اس علاقے میں شکر سازی کے کارخانے لگائے جائیں۔ اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا جاتا تو شائد ملک میں شکر کی قلت کی شکایت اس پیمانے پر محسوس نہیں کی جاتی اس کے علاوہ اس علاقہ کے کاشت کاروں کی اقتصادی حالت بھی اچھی ہو جاتی، اور وہ آسانی سے سرکاری واجبات ادا کر دیتے۔ مگر بد قسمتی سے دوسرے ترقیاتی منصوبے کی طرح یہ تجویز بھی سرخ فیتے کا شکار رہی۔

کوٹری بیراج کے علاقہ میں پنجاب، بلوچستان، اور سرحد کے کاشت کار آباد ہیں، یہ لوگ پیشہ ور کاشت کار ہیں اور زمین کی خریداری میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اور اس علاقہ کو اپنا گھر، اپنا وطن بنا لیا۔ یہ ملک کی کتنی بد قسمتی ہے کہ ایسے لوگوں کو بیدخلی کے نوٹس جاری کئے جا رہے ہیں جنہوں نے ایک بنجر علاقہ کو قابلِ کاشت بنا دیا۔ آج وہ لوگ اپنے وجود کی بقا کے لئے جنگ کر رہے ہیں، کہ ان کی واپسی کے سارے راستے بند ہیں۔ یہ کاشت کار ایک ایسے علاقہ میں آباد ہیں جو مستقبل میں کراچی جیسے شہر کی ضرورت کے مطابق دودھ اور سبزی کی سپلائی میں ایک نمایاں کردار ادا کرنے والا ہے۔

انجمن کاشت کاران کوٹری بیراج نے مذکورہ بالا حقائق کے پیشِ نظر حکومت کو جو یادداشت روانہ کی ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ اگر کوٹری بیراج کے پچیس تیس ہزار کاشت کار خاندان کو انکی زمینوں سے بے دخل کیا گیا تو پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے صوبوں کے لئے ان بے دخل ہاریوں کی سر نو آباد کاری ایک سنگین سیاسی اور اقتصادی مسئلہ بن جائے گا۔ انجمن نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ زمین کی منسوخی کے نوٹس فوری طور پر واپس لئے جائیں۔ اور سرکاری واجبات کی وصولی کی مدت ۱۹۷۵ء تک بڑھائی جائے۔ ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی کے ذریعہ اس علاقہ میں زرعی منصوبوں کی ناکامی کے اسباب کی تحقیقات کرائی جائے۔ کیونکہ کوٹری بیراج ملک کو زرعی اعتبار سے خود کفیل بنانے کی آخری امید ہے۔ زمین کے معیار کے مطابق قیمتوں کا سر نو تعین کیا جائے۔ اس کے مطابق شرحِ سود میں بھی کمی کی جائے۔ اور واجبات کی ادائگی کے لئے معقول مدت دی جائے۔

موجودہ حکومت اقتدار میں آنے کے بعد سے ملک کے کاشت کاروں اور ہاریوں کے حالات میں انقلابی تبدیلی لانے

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

راشد مفتی

ارضِ ویتنام

آگ اور دھوئیں کی زد میں ہیں پھر تیرے صبح و شام
پھر لے رہا ہے دستِ ستم تجھ سے انتقام
مقتل قدم قدم تو صلیبیں ہیں گام گام
پھر چیرہ دستیوں کا ہدف ہیں تیرے عوام
اے ارضِ ویتنام ، اے ارضِ ویتنام

مشکل کہ رکھ سکے تجھے محکوم سامراج
شورش تری سرشت ، بغاوت ترا مزاج
اونچا ہے حرّیت کا علم تیرے دم سے آج
کہسار کی طرح ہیں صف آرا تیرے عوام
اے ارضِ ویتنام ، اے ارضِ ویتنام

صدیوں کی نیند سے ہوئے بیدار اہلِ شرق
اب دشمنوں پہ ٹوٹ کے گرنا ہے مثلِ برق
آنے نہ پائے جہدِ مسلسل میں کوئی فرق
اب ایشیا میں پاؤں جمانے نہ پائے سام
اے ارضِ ویتنام ، اے ارضِ ویتنام

جاری ہے اس طرح نظریات کی یہ جنگ
ہم کیا حریف بھی ہیں تیرے حوصلوں پہ دنگ
جس سمت دیکھئے نظر آتا ہے سُرخ رنگ
مہمان کوئی دَم کا ہے اب مغربی نظام
اے ارضِ ویتنام ، اے ارضِ ویتنام

مظلومیت کا کوئی وطن ہے نہ کوئی ذات
ہم تجھ سے دور رہ کے بھی ہیں تیرے ساتھ ساتھ
اپنی سحر پہ بھی ابھی سایہ فگن ہے رات
اس ابتلا میں حوصلہ افزا ہے تیرا نام
اے ارضِ ویتنام ، اے ارضِ ویتنام

ظاہری خبریں
اندرونی کہانیاں



اصغر خان کی سیاسی قلابازیاں

اصغر خان قسمت آزما رہے ہیں

شوکت صدیقی

اصغر خاں لاف زنی کرتے، خانہ جنگی کی دھمکیاں دیتے۔ دھاوے پر دھاوے مارتے کراچی پہنچے، اور اس شان سے پہنچے ع

آگے آگے میں پیچھے میری رسوائی چلی

جہاں گئے وہیں فتنہ فساد برپا ہوا۔ کہیں گولیاں برسیں، کہیں لاٹھیاں چلیں۔ کہیں ڈنڈے کھائے، کہیں پتھر۔ ان کے اس سیاسی کردار کو ایک کارٹونسٹ نے یوں پیش کیا۔ سر پر فولادی خود۔ زرہ بکتر زیب تن۔ ہنہناتے گھوڑے پر سوار۔ ایک ہاتھ تلوار کے قبضے پر۔ دوسرے میں مشعل۔ ہر طرف آگ کے شعلے اور جھلسی ہوئی بستیاں۔ بکھری ہوئی لاشوں پر منڈلاتے ہوئے گدھ اور اصغر خان کے چہرے پر بھیانک قہقہے۔

اس کارٹون میں وہ ایک تاتاری لٹیرے کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ ان کی سیاست کا انداز بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ مقصد اس کا ہوس اقتدار ہے۔ وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ خواہ وہ امریکی سامراج کی حاشیہ برداری سے حاصل ہو یا بھارتی توسیع پسندوں کی چاپلوسی سے۔ پنجاب کے جاگیردار اور کراچی کے سرمایہ دار بھی انھیں برسر اقتدار دیکھنا چاہتے ہیں۔ انتخابات کی ریس میں ہارے ہوئے اس گھوڑے پر پہلے بھی انھوں نے رقم لگائی تھی، اور اب بھی لگاتے ہیں۔ اور اس امید پر لگاتے ہیں کہ شاید کوئی داؤ لگ جائے۔ جماعت اسلامی کو بھی ایک ایسے بورژوا سیاست دان کی ضرورت ہے جو بے تحاشا ہو۔ کوئی کل اس کی سیدھی نہ ہو۔ جدھر موڑ دیا اسی طرف چل دیا۔

اصغر خاں کی چند سالہ سیاسی زندگی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ ان کی سیاست کا نہ کوئی محور ہے اور نہ کوئی واضح سمت۔ وہ حالات کے بہاؤ میں نشتم پشتم چلے جا رہے ہیں۔ جیسا موقع دیکھتے ہیں ویسا ہی رنگ بدل لیتے ہیں۔ وہ ۱۹۶۹ء میں پاکستان کی سیاست میں داخل ہوئے۔ اس وقت سے اب تک انھوں نے نت نئے سیاسی پینترے دکھائے ہیں۔ طرح طرح کے چولے بدلے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کل وہ کیا کرنے والے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں خود بھی یہ نہیں معلوم کہ آئندہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔ وہ ہر کام پہلے کرتے ہیں بعد میں سوچتے ہیں۔

ان کا تعلق اس فوجی نوکر شاہی سے ہے جس نے محنت کش عوام کو عقل کا اندھا اور حشرات الارض کی طرح حقیر سمجھا اور حکمرانی کو اپنا حق قرار دیا۔ اور سنگین کی نوک پر کم و بیش ۱۳ سال تک پاکستان کو اپنی موروثی جاگیر سمجھ کر حکمرانی کی۔

یہ حکومت فوجی نوکر شاہی کی آمریت تھی۔ آغاز اس کا اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں عام انتخابات ہونے والے تھے۔ سیاسی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اسکندر مرزا کی سربراہی میں ایک نہایت غیر مقبول حکومت آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ یہ حکومت مغربی پاکستان کے جاگیرداروں اور شہری نوکر شاہی کے گٹھ جوڑ پر مشتمل تھی۔ فوجی نوکر شاہی ان کی پشت پناہ تھی۔

عوام کے بدلے ہوئے تیور بتا رہے تھے کہ اب اسکندر مرزا اور ان کے حواریوں کا اقتدار زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہے گا۔ آنے والے انتخابات کے نتائج بہت واضح تھے۔ گرتے ہوئے اقتدار کو بچانے کے لئے اسکندر مرزا نے اس مرحلہ پر اپنے ترکش کا آخری تیر چلایا۔ انھوں نے فوجی نوکر شاہی کی امداد حاصل کی۔ یہ نیا تجربہ نہ تھا۔ غلام محمد اس حربے کو پہلے ہی کئی بار آزما چکے تھے۔ جب کبھی ان کا اقتدار ڈانوا ڈول ہوا انھوں نے

وہ شیخ مجیب کی کابینہ میں وزیر بننا چاہتے تھے

فوجی نوکر شاہی کی امداد طلب کی۔ غلام محمد اور فوجی نوکر شاہی کے درمیان اسکندر مرزا رابطے کے فرائض انجام دیتے تھے جو اس وقت وزارتِ دفاع کے سیکرٹری تھے۔

اسکندر مرزا کا معاملہ یہ تھا کہ شہری نوکر شاہی میں اہم مقام حاصل کرنے کیساتھ ساتھ وہ فوجی نوکر شاہی کی بھی نمائندگی کرتے تھے۔ برطانوی نو آباد کاروں نے اس کی تربیت اس طرح کی تھی کہ وہ برطانوی حکومت میں فوجی افسر بھی رہے، اور شہری انتظامیہ کے عہدیدار بھی رہے۔ مگر وہ جس عہدے پر بھی رہے کام ان کا انگریزوں کے لئے سازشوں کا جال پھیلانا۔ قبائلی سرداروں کو رشوت دینا اور اپنے انگریز آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ وہ اپنے اس کردار پر کبھی شرمندہ نہ ہوئے۔ نجی محفلوں میں بڑے فخر سے اس کا اظہار کرتے تھے۔ البتہ پاکستان کے عوام کا المیہ ہے کہ ان کی قسمت میں ایسے حکمران بھی لکھے گئے۔

غرض یہ کہ اسکندر مرزا کی سربراہی میں جاگیرداروں اور شہری نوکر شاہی کا اقتدار عوام میں جس قدر غیر مقبول ہوتا گیا، فوجی نوکر شاہی کے ہاتھ اس قدر مضبوط ہوتے گئے۔ اس طرح فوجی نوکر شاہی کی قوت کے بل پر اسکندر مرزا مشرقی بنگال کے گورنر بنے۔ پھر مرکزی وزیرِ داخلہ اور پھر ایک ایسا وقت آیا کہ نام غلام محمد کا تھا اور حکمرانی اسکندر مرزا کرتے تھے۔ نوعیت اس حکمرانی کی یہ تھی کہ چوہدری محمد علی شہری نوکر شاہی کی اور اسکندر مرزا فوجی نوکر شاہی کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان دونوں نے ساز باز کر کے ایک روز غلام محمد کا کانٹا بھی بیچ سے نکال دیا۔ اور براہِ راست اقتدارِ مملکت سنبھال لیا۔ اس طرح اسکندر مرزا گورنر جنرل بنے اور چوہدری محمد علی وزیرِ اعظم۔

یہ کارروائی، محلاتی سازشوں ہی کی ایک کڑی تھی۔ جس کا سلسلہ بعد میں بھی چلتا رہا۔ وزارتیں بنتی رہیں۔ وزیر ایک چور دروازے سے ایوانِ حکومت میں داخل ہوتے اور دوسرے چور دروازے سے باہر نکل جاتے۔ حصولِ اقتدار کیلئے جو تم پیزار ہوتی۔ جوڑ توڑ ہوتے۔ سیاسی دھڑے بندیاں ہوتیں، اس صورتِ حالات سے فوجی نوکر شاہی نے فائدہ اٹھایا اور اس کی سیاسی قوت روز بروز بڑھتی گئی۔ چنانچہ اس بڑھتی ہوئی سیاسی قوت کے بل پر اسکندر مرزا پہلے صدرِ مملکت بنے۔ ملک کا پہلا دستور بھی بنا۔ پاکستان، اسلامی جمہوریہ بھی بنا مگر اقتدارِ مملکت پر قبضہ اسکندر مرزا ہی کا رہا۔

مگر جب اس سیاسی شعبدہ گری سے عوام عاجز آ گئے ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ تو انھوں نے انتخابات کے ذریعے اسکندر مرزا اور ان کے اتحادیوں کو ہٹانا چاہا۔ اس اہم سیاسی موڑ پر اچانک ایوب خان نمودار ہوئے۔ ملک پر مارشل لاء نافذ ہوا۔ اسمبلیاں ٹوٹیں۔ وزارتیں برطرف ہوئیں۔ سیاستدان زیرِ عتاب آئے۔ کچھ نظر بند ہوئے۔ کچھ جیلوں میں ڈالے گئے لیکن اس دفعہ ایوب خان حکومت میں عارضی طور پر شامل ہونے نہیں آئے تھے۔ فوجی نوکر شاہی اب بلا شرکت غیرے مکمل اقتدار چاہتی تھی۔ چنانچہ ایوب خان نے اپنے ہمنوا جرنیلوں کے مشورے پر اسکندر مرزا کا بھی دھڑن تختہ کر دیا۔

اس طرح مارشل لاء کے ذریعے عوام کے جمہوری حقوق پر ڈاکہ ڈالا گیا۔ جمہوریت کو فوجی نوکر شاہی کے بوٹوں تلے روندا گیا۔ ذلیل و خوار کیا گیا۔ یہ تاریخِ پاکستان کا سیاہ ترین باب تھا۔ عجب المیہ ہے کہ بھارت میں دس کمانڈر انچیف سبکدوش ہوئے، اور ایک وزیرِ اعظم رہا۔ اور پاکستان میں دس وزیرِ اعظم بدلے اور ایک کمانڈر انچیف رہا۔ جو جنرل سے خود ہی فیلڈ مارشل بنا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے صدرِ مملکت بنا اور گیارہ سال تک ٹھاٹھ سے حکمرانی کرتا رہا۔ مونچھوں پر تاؤ دیتا رہا۔ نہ اس نے انتخابات لڑے نہ عوام کی تائید حاصل کی، نہ وہ عوام کے پاس گیا۔ نہ ان کے مسائل سمجھنے کی کوشش کی۔ کچھ کیا تو صرف اتنا کیا کہ تلوار سونتی اور بے دھڑک ایوانِ حکومت میں گھس کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

کی چھپی ہوئی آرزو نے انگڑائی لی۔ سنا ہے ان دنوں وہ نجی محفلوں میں یہ کہتے نظر آتے تھے کہ اقتدارِ مملکت میں بری فوج کے ساتھ فضائیہ کو بھی برابر کی نمائندگی دی جائے۔ حالانکہ مسلح افواج میں ایسا کوئی رجحان نہ تھا۔ ساری کشمکش اس وقت کی فوجی نوکر شاہی میں تھی۔ اصغر خاں اس کشمکش سے فائدہ اٹھا کر اقتدار میں ساجھے دار بننا چاہتے تھے۔

اڑتے اڑتے یہ بات ایوب خاں کے کانوں میں پہنچی انہوں نے اصغر خاں کو بلا کر خوب ڈانٹا۔ ملازمت سے برطرف کرنا چاہا تو انہوں نے گڑگڑا کر معافی مانگی۔ ایوب خاں نے صرف اتنی سزا دی کہ انہیں فضائیہ سے ہٹا کر پی آئی اے کا سربراہ بنا دیا۔ عہدہ بدل گیا لیکن ملازمت برقرار رہی۔ انہوں نے اسے بھی غنیمت جانا پی آئی اے میں انہوں نے نت نئے گل کھلائے۔ اسی زمانے میں کوارٹروں کا اسکنڈل مشہور ہوا۔ نوعیت اس کی یہ تھی کہ پی آئی اے کے ملازمین کے لیے رہائشی کوارٹر بنائے گئے جن کی تعمیر میں لاکھوں روپے خرد برد ہوئے۔ اسی طرح ائر ہوسٹسوں کے نئے لباس کا اسکنڈل سننے میں آیا۔ ڈیزائن سے لے کر لباسوں کی تیاری تک لاکھوں روپے کا ہیر پھیر ہوا۔ ایوب خاں کو مجبوراً انہیں پی آئی اے سے برطرف کرنا پڑا۔

جب انہیں یہ علم ہو گیا کہ پی آئی اے سے ان کا چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے تو انہوں نے فوجی حکمتِ عملی اور سیاست کے بارے میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا۔ سنا ہے اس کا مواد

سرمایہ داروں کو "بے نتھے بیل" سیاستدان کی ضرورت ہے

اصغر خاں نے جمہوریت کی پامالی اور عوام کے حقوق پر ڈاکہ زنی کا یہ سارا ناٹک نہ صرف دیکھا بلکہ اس میں بنیادی کردار ادا کیا۔ انہوں نے ایوب خاں کی آمریت کے قیام میں معاون اور مددگار کے فرائض انجام دیئے۔ اقتدارِ مملکت پر قبضہ کرنے کی سازش میں شریک ہوئے البتہ انہیں ایوب خاں سے صرف اتنا گلہ ضرور تھا کہ اقتدارِ مملکت میں انہیں کوئی منصب نہ ملا۔ بحریہ کے سابق سربراہ ایڈمرل چوہدری نے غلطی یہ کی کہ ابتدا ہی میں اس گلہ کا اظہار کر دیا۔ لہٰذا ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اصغر خاں نے مصلحت سے کام لیا اور خاموش رہے۔

مگر جب عوام میں ایوب خاں کی غیر مقبولیت بڑھی اور اُن کے زوال کے آثار ابھرنے لگے تو اصغر خاں کے دل میں ہوسِ اقتدار

امریکی سفارت خانے نے مہیا کیا۔ یہ مضامین بعض اخبارات میں اشتہارات کے نرخ پر چھپے۔ معاوضہ ان کا ایک اخبار کے ذریعے پی ایل ۴۸۰ کے خفیہ فنڈ سے ادا کیا گیا۔ ان مضامین میں جہاں حکومت پر ڈھکی چھپی تنقید تھی وہیں اصغر خاں کے ذہنی افلاس کا سراغ بھی ملتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بدلتے ہوئے بین الاقوامی حالات کے تحت چین کے ساتھ پاکستان کے تعلقات بڑھ رہے تھے امریکہ کو یہ رجحان پسند نہ تھا۔ وہ ایوب خاں کو ہٹا کر ایک ایسے شخص کو برسرِ اقتدار لانے کا خواہشمند تھا جو پاکستان میں اس کے مفادات کا پورا پورا تحفظ کر سکے۔ چنانچہ نگاہِ انتخاب اصغر خاں پر پڑی۔ ایک خبر رساں ایجنسی کے ذریعے معاملہ طے ہوا۔

اس طرح اصغر خاں کو سیاست میں لانے کی پہلی کوشش کی گئی۔ ایوب خاں کو جب اس کا پتہ چلا تو انہوں نے اصغر خاں کو بلا کر خوب جھاڑا۔ سنا ہے گالیوں سے تواضع کی۔ انہوں نے خاموشی سے سب کچھ سنا اور آئندہ کے لئے "نیک چلنی" کی ضمانت دے کر چلے آئے اور خاموشی کے ساتھ اپنے وسیع پولٹری فارموں اور زمین و جاگیر کی دیکھ بھال کرنے لگے اللہ کا دیا ان کے پاس سب کچھ ہے۔ فضائیہ اور خصوصیت کے ساتھ پی آئی اے کی ملازمت میں انہوں نے دبا کر کمایا، خوب پیدا کیا۔ اتنا کہ ان کی سات پشتوں کے کام آئے اب نہ انہیں بال بچوں کا پیٹ پالنے کی فکر ہے نہ مستقبل کا دھڑکا ہے شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہوائی جہازوں میں اڑے اڑے پھرتے ہیں۔ اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں قیام فرماتے ہیں

کسی کو یہ آسائشیں زندگی میں مہیا ہوں تو وہ نچلا نہیں بیٹھتا اور اصغر خاں تو ہوس اقتدار کے پرانے مریض ہیں، چنانچہ جب ایوب خاں کے اقتدار کا زوال شروع ہوا اور عوامی جدوجہد نے زور پکڑا تو انہوں نے ایبٹ آباد کے سبزہ زاروں میں اپنی عالیشان کوٹھی پر ایک پریس کانفرنس بلائی اور سیاست میں باقاعدہ داخل ہونے کا اعلان کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو اس وقت جیل میں تھے۔ انہوں نے

جو کام غلام محمد نہ کر سکا

وہ اسکندر مرزا نے

پورا کر دکھایا

موقع سے فائدہ اٹھایا اور عوام کے رہبر بن بیٹھے اس وقت سے عوام کی گردن پر پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہیں، خود کو عوامی رہنما کہتے ہیں ان کے عوامی رہنما بننے کی نوعیت یہ ہے کہ جب عوام ایوبی آمریت کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے تو اصغر خاں بھی فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔ یہ لپک کر عوام کے آگے آگے چلنے لگے۔ ان کے اس انداز رہبری پر ایک لطیفہ بہت مشہور ہوا۔ کہتے ہیں کہ سڑک پر ایک ہاتھی جھومتا جھامتا جاتا تھا۔ جب وہ ایک درخت کے نیچے سے گزرا تو ایک چوہا شاخ سے کود اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ہاتھی ایک پل پر سے گذرا۔ اس کے وزن سے پل لرزنے لگا جب ہاتھی نے پل عبور کیا تو چوہا بڑے فخر سے بولا "یار ہاتھی! میں تو ڈر رہا تھا کہ ہم دونوں کے وزن سے کہیں پل ٹوٹ نہ جائے۔" ہاتھی نے چوہے کی یہ چوں چوں سنی تو حیرت سے کہنے لگا "اے چوہے تو کدھر سے نازل ہو گیا"

اصغر خاں کی عوامی رہنمائی کی وجہ تسمیہ اس سے زیادہ اور

اصغر خان میں امریکہ کی دلچسپی جاری ہے

کچھ نہیں۔ شروع میں انہوں نے عوام کو یہ تاثر دیا کہ وہ پیپلز پارٹی کے ساتھ ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی سیاسی ساکھ بنائی مگر جب ذوالفقار علی بھٹو جیل سے رہا ہو کر آئے تو اصغر خاں کی چمک دمک ماند پڑ گئی۔ یہ کچھ اور ہی خواب دیکھتے تھے۔ وہ پورے ہوتے نظر نہ آئے تو کنی کاٹ کر علیحدہ ہو گئے۔ جسٹس پارٹی کے نام سے علیحدہ سیاسی دکان سجائی۔ مگر یہ کاروبار راس نہ آیا ٹھپ ہونے لگا تو پی۔ ڈی۔ پی میں شامل ہو گئے وہاں ایک سے ایک سیاسی گرگ باراں دیدہ موجود تھا۔ یہ قیادت و سیادت کی آرزو لے کر گئے تھے۔ کسی نے ان کی دال نہ گلنے دی۔ دل برداشتہ ہو کر سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ روٹھ کر ایبٹ آباد میں بیٹھ گئے

برا ہو ہوس اقتدار کا۔ قرار نہ آیا۔ ایک نئی سیاسی جماعت بنائی۔ اس لئے کہ قیادت صرف اسی طور پر حاصل ہو سکتی تھی۔ نام اس کا اردو میں الگ، بنگلہ میں الگ رکھا۔ سیاست میں یہ نئی جدت نکالی اس میں ایک فائدہ بھی تھا۔ مغربی پاکستان میں ان کی سیاست علیحدہ تھی اور مشرقی پاکستان میں علیحدہ۔ یہ جماعت تحریک استقلال تھی۔ سچ پوچھئے نہ تو یہ جماعت تھی نہ تحریک تھی۔ یہ صرف اصغر خان کے ہوس اقتدار کا بہروپ تھا۔

غرضیکہ تحریک استقلال کے نام پر انہوں نے دھوم دھام سے انتخابات میں حصہ لیا۔ اور با جماعت شکست کھائی۔ یہ واحد سیاسی جماعت تھی جس کا کوئی بھی امیدوار پورے ملک میں نہ قومی اسمبلی، نہ صوبائی اسمبلی کے لئے منتخب ہو سکا۔ یہ شرمناک شکست عبرت کے لئے کافی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اس رسوائی سے سبق حاصل کرتا۔ سیاست سے توبہ کرتا اور خاموش زندگی بسر کرتا۔ مگر اصغر خاں نے اتنی بڑی ٹھوکر کھا کر بھی کچھ نہ سیکھا۔ اب انہوں نے ایک اور سیاسی پینترا بدلا۔ مغربی پاکستان سے مایوس ہو کر انہوں نے مجیب الرحمان پر تکیہ کیا کہ شاید ان کی طفیل وزارت یا سفارت، کوئی عہدہ یا منصب مل جائے۔ ان دنوں ڈھاکہ کے چکر کاٹنا اور شیخ مجیب کے گھر کے طواف کرنا ان کا معمول بن گیا۔

مشرقی پاکستان میں جو سیاسی بحران پیدا ہوا اور مجیب الرحمان نے ہٹ دھرمی کا جو رویہ اختیار کیا اس میں اصغر خاں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مجیب کے ساتھ اس سیاسی گٹھ جوڑ میں ان کا کیا مقصد تھا۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب جنوری ۷۲ء میں شیخ مجیب رہا ہوئے۔ اصغر خاں نے نہ صرف اس کا خیر مقدم کیا بلکہ بنگلہ دیش تسلیم کرنے کا زبردست مطالبہ کیا۔

اب اصغر خاں بنگلہ دیش تسلیم نہ کرنے کی مخالفت کرتے ہیں۔ عجیب تماشہ ہے۔ کل تک شیخ مجیب محب وطن تھے۔ آج غدار ہیں۔ کل بنگلہ دیش جائز تھا۔ اب ناجائز ہے۔ اصغر خاں کے سیاسی موقف میں یہ تبدیلی کیوں پیدا ہوئی۔ اس کا سبب وہ خود بھی نہیں جانتے۔ اس لئے کہ اس طرح موقف بدلنا۔ ان کا شیوہ ہے اس معاملہ میں ان کا حافظہ بہت کمزور ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ نہ انہیں عوام سے غرض ہے۔ نہ ان کے مسائل سے۔ انہیں صرف اپنی ذات سے غرض ہے۔ انہیں صرف لیڈری چاہیئے۔ اور اس لیڈری کو سیڑھی بنا کر اقتدار چاہیئے۔ وہ پھر کسی فوجی آمریت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ خوش فہم آدمی ہیں۔ اسی خوش فہمی میں خانہ جنگی کی دھمکی دے بیٹھے۔ خانہ جنگی کون کرے گا؟ عوام! عوام اصغر خاں کے سیاسی کردار کو بخوبی سمجھتے ہیں ان کا ماضی عوام کے سامنے ایک کھلی کتاب ہے۔ جو پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ لوگو! عوام کے دشمن اور جمہوریت کے اس قاتل کو پہچان لو۔ اس کے راون کی طرح ۵۲ چہرے ہیں۔ جیسا موقعہ دیکھا ویسا چہرہ سامنے کر دیا۔



جاپانی گوریلوں کا دیر یاسین آپریشن

انہوں نے اپنی جانیں نچھاور کر کے پرولتاری بین الاقوامیت کا پرچم

دیر یاسین کا معرکہ لائیڈا ایئرپورٹ پر گذشتہ مئی میں پیش آیا تھا۔ یہ ایئرپورٹ اسرائیلی مقبوضہ علاقے میں واقع ہے۔ اس کامیاب اور شاندار معرکہ کی تمام تر ذمہ داری پاپولر فرنٹ برائے آزادئ فلسطین نے قبول کی تھی۔ اس کارروائی میں پاپولر فرنٹ کے ایک خاص گروپ کے اراکین نے حصہ لیا تھا۔ جس کا نام شہید ایک حریت پسند پیٹرک آرجیولو" کے نام سے موسوم ہے۔ لائیڈا ایئرپورٹ پر حریت پسند جیالوں کا یہ حملہ عین اس وقت کیا گیا جب کہ جون ۱۹۶۷ء کی شکست کو پانچ سال مکمل ہو چکے تھے۔ حریت پسندوں کے اس ناقابلِ فراموش معرکے نے اقوام عالم کو چونکا دیا تھا۔ اس مہم کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں جاپانی نوجوانوں نے اپنے خون سے فلسطین کی آزادی کی تاریخ میں اپنا نیا باب تحریر کیا۔

اس مہم کے سلسلے میں پاپولر فرنٹ نے عوام اور دنیا کے انقلابی قوتوں کے سامنے بعض حقائق بیں پیش کئے ہیں تاکہ صورتِ حال کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔ اور ذہنوں سے وہ دھند صاف ہو سکے جو مغربی پریس کے پروپیگنڈے سے چھا گئی ہے۔

⊙ —— سامراجی، عرب اور صیہونی رجعت پسندوں کے خلاف جنگ کے دوران ہم اپنے اس مقصد پر قائم رہیں گے۔ کہ دشمن کو ہر جگہ نشانہ بنایا جا سکے۔

⊙ —— سامراجی قوتیں ہمارے مقبوضہ علاقوں میں اپنی پوزیشن مستحکم بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں تاکہ سامراجی، صیہونی اور رجعت پسندانہ مفادات کو اس علاقے میں استحکام بخشا جا سکے۔ اس سلسلے میں بعض مفاد پرست عرب ریاستیں بھی دشمن کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کی مدد کر رہی ہیں۔

⊙ —— جن عرب بورژوائی ممالک میں فلسطینی تحریکِ مزاحمت سرگرمی کے ساتھ دشمن نبرد آزما ہے وہاں کی حکومتیں ہر طریقے سے اس تحریک کو کچلنے کی متمنی ہیں۔ جو یقیناً اُن کے اپنے مفاد میں ہے۔ پاپولر فرنٹ اس بات پر پختہ یقین رکھتی ہے کہ تحریکِ مزاحمت اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے جب یہ اندرونی یا بیرونی دباؤ سے محفوظ ہو۔

⊙ —— "متحدہ عرب ریاست" کا خاکہ دراصل سامراجی اور اردن کی رجعت پسند حکومت کی ناپاک سوچ کا مظہر ہے۔ فلسطینی عوام کی خواہشات کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

⊙ —— لائیڈا ایئرپورٹ پر ہمارے بہادر اور حریت پسند جیالوں کی کارروائی دنیا کے سامنے ان انقلابی نوجوانوں کا ایک وسیع اور واضح تصور پیش کرتی ہے۔ جن کا عقیدہ فتح اور مسلسل جدوجہد اور قربانی ہے۔

⊙ —— ہمیں یقین ہے کہ لائیڈا ایئرپورٹ کے واقعہ کو غلط رنگ میں پیش کیا جائے گا۔ انسانیت اور بے گناہ لوگوں کی باتیں کی جائیں گی۔ لیکن ہم اسرائیلی قصابوں کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ہم ہر صورت میں اُن کے ایک ایک ظلم کا جواب طلب کریں گے۔

⊙ —— "پیٹرک آرجیولو" کے بہادر کامریڈ جنہوں نے "دیر یاسین" آپریشن میں شرکت کی تھی، سامراجی اور صیہونی قوتوں کے خلاف فلسطینی عوام کی جدوجہد میں شامل ہونے کے لئے ہزاروں میل دور سے آئے تھے۔ وہ کون سی کشش تھی جس نے انہیں جاپان سے فلسطین آنے پر مجبور کر دیا؟۔ سامراج کے خلاف ایک بین الاقوامی نفرت اور آزادی اور انصاف کے لئے بین الاقوامی محبت —— ان جیالوں نے فلسطینی سرزمین پر اپنی جانیں نچھاور کر کے پرولتاری بین الاقوامیت کا پرچم بلند رکھا اور دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ فلسطینی عوام کی جدوجہد محدود نہیں ہے بلکہ اس دھارے میں دنیا کے ہر خطے کا انقلابی موجود ہے فلسطینی عوام ان تین عظیم جیالوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے لئے اپنے دلوں میں فخر کا جذبہ رکھتے ہیں اور انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

جیسے کہ ہم پہلے ابتدائی سطروں میں تحریر کر چکے ہیں کہ لائیڈا ایئرپورٹ پر دشمن کے خلاف کارروائی پر مغربی پریس اور سامراج نواز پریس نے شور برپا کر ڈالا تھا۔ اس کارروائی میں تین جاپانی حریت پسندوں نے حصہ لیا۔ اور دشمن کے بے شمار افراد کو ٹھکانے لگا دیا۔ دو حریت پسند شہید ہوئے اور ایک کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ سامراجیوں نے اس کارروائی کو قتلِ عام اور بربریت قرار دیا اور ترقی پسند حلقوں نے اسے آزادی جنگ کا ایک حصہ قرار دیا۔ مغربی ممالک اور جاپان کے صحافیوں نے اس واقعہ کے فوراً بعد پاپولر فرنٹ کے مرکزی اطلاعات پر دھاوا بول دیا تھا تاکہ لائیڈا ایئرپورٹ پر پیش آنے والے واقعہ کی تفصیلات معلوم کی جا سکیں۔ ذیل میں اُن بے شمار سوالات سے چند سوال اور ان کے جواب پیش کئے جا رہے ہیں جو صحافیوں نے پاپولر فرنٹ کے نمائندوں اور ترجمانوں سے کئے تھے۔ ان سوالات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغربی صحافی اور وہاں کے تشہیری اداروں کی سوچ کا محور کیا ہے۔

سوال: - لائیڈا ایئرپورٹ پر حملے کا پروگرام کیوں بنایا گیا؟

جواب: - لائیڈا ایئرپورٹ کا معرکہ واحد معرکہ نہیں جو اب تک ہم نے انجام دیا ہے۔ یہ ہماری جنگی کارروائیوں کی ایک کڑی ہے۔ ہم اسرائیلی قبضے، نسلی بنیادوں پر نفرت اور استحصال کے خلاف انقلابی عمل کو اپنی جدوجہد کے دائرے میں جاری رکھنے کا عزم کر چکے ہیں۔ اس جدوجہد کا آغاز کچھ عرصے پہلے ہو چکا ہے۔ اور اب دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جو ہماری اس جدوجہد کا رُخ پھیر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اس انقلابی عمل اور تشدد کے درجوں میں اضافے کا پروگرام مرتب کیا ہے۔ ہماری اس طویل جدوجہد میں بے شمار مجاہدوں نے قربانیاں دی ہیں۔ یہ قربانیاں انقلابی جدوجہد کی کٹھن راہ میں پیش کی گئیں۔ اس وجہ سے آپ لائیڈا آپریشن کو تمام جدوجہد سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ اس طرح آپ اس کو ہماری عوامی جدوجہد کی تحریک سے الگ کر رہے ہیں۔ اگر آپ اس آپریشن کو اس کے ماضی کے محرکات سے جدا کر کے اور اسے ہوا میں معلق سمجھتے ہیں تو آپ اس صورت میں اِسے بے معنی اور مہمل سمجھیں گے۔ اس معاملے کی سچائی اس طرزِ فکر کے بالکل خلاف ہے۔ لائیڈا آپریشن کیا ہے؟ دشمن کے ایئرپورٹ

ہر اسرائیلی پانچ سو ڈالر سالانہ

جنگی ٹیکس ادا کرتا ہے

کر دیا

و ترجمہ

ین خان

رب ریاست"

و بہ سامراج

دن کی

ت پسند

ں نے

کیا تھا







پر صرف پندرہ منٹ ؟ —— یقیناً نہیں۔ مہاجر کیمپوں میں منعقد ہونے والے بے شمار عوامی جلسوں اور مختلف بیانات میں اس مسئلے کی تشریح و وضاحت اور تشہیر کی گئی ہے "یہ مقبوضہ علاقے میں دشمن کے کنٹرول اور جبری استحکام کے خلاف مظلوم فلسطینیوں کی آواز ہے۔ یہ ایک بے باک اعلان ہے کہ مزاحمت کی تحریک جاری رہے گی۔ یہ جون ۱۹۶۷ء کی اسرائیلی فتح کے تصور کو مسمار کرنے کی ایک کوشش ہے اور یہ ہمارے حوصلوں کی بلند پرواز ہے۔ جو اس معرکے کے بعد تمام عرب دنیا میں ظاہر ہوئی —— یہ غزہ کے اس قیدی کی آواز ہے جو اس نے ایک اسرائیلی عدالت میں عزم اور بلند حوصلگی کے ساتھ بلند کی تھی کہ "یہ میری بدقسمتی ہے کہ میری روح لائیڈا ایئرپورٹ پر حملے میں شریک نہ ہونے پر بے چین ہے" لائیڈا آپریشن مزاحمت کے ایک سلسلے کی کڑی ہے جو عرصے سے جاری ہے اور جاری رہے گا۔

آپ کے سوال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کارروائی کی کتنی اہمیت اور ضرورت تھی۔ کیا آپ اس بات پر حیرت محسوس نہیں کرتے کہ اس نوعیت کا ایک سوال ایک قومی تحریکِ آزادی سے پوچھا جاتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے معاملے پر جو قومی آزادی کی جدوجہد کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ہم اس مغربی اور اسرائیلی پروپیگنڈہ مہم کے ذمہ دار نہیں جس سے یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ ہماری مسلح جدوجہد ختم ہو چکی ہے۔ آپ کے سوال میں حیرت و استعجاب کا عنصر دراصل ایک گہرے تجسس اور شکوک و شبہات سے ابھرا ہے۔ جو مغرب کے ذرائع تشہیر نے بے شمار ذہنوں میں پیدا کیا ہے۔ جہاں تک فلسطینی اور عرب عوام کا تعلق ہے اس علاقے میں انقلابی جنگ ہمیشہ جاری رہے گی۔ اور جس کے اختتام کی نشاندہی ہم نہیں کر سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسرائیلی جارحیت کے مفادات اور ساتھ ہی سامراجی مفادات اس کے خلاف اپنے اتحاد کا مطالبہ کرتے ہیں۔ آپ کا سوال یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ سامراجی نکتۂ نظر اور طرزِ فکر سے مرعوب ہیں۔ انہیں خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے اسی نکتۂ نظر کا استعمال کرتے ہیں۔

سوال:۔ لیکن لائیڈا ایئرپورٹ ہی کیوں ؟ یہ ایک شہری ہوائی اڈہ ہے۔ بے گناہ سیاح وہاں آتے جاتے ہیں۔ ایسے شہری اور غیر فوجی مقام پر فائرنگ بربریت اور دہشت انگیزی کے سوا کچھ بھی نہیں تھی۔ بے شمار شہری ہلاک ہوئے۔

جواب:۔ دنیا میں کوئی فوجی اصول نہیں جو اس سے انکار کر سکے کہ دورانِ جنگ ہوائی اڈے حملوں کا نشانہ نہیں بنتے —— آپ کے اس سوال کی بنیاد مکر و فریب کے سوا اور کچھ نہیں

جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے بے شمار شہری ہوائی اڈوں پر بمباری کی تھی اور مختلف اقسام کے بموں کی بارش کی تھی جن میں ٹائم بم بھی شامل تھے۔ انہوں نے اس سے چند قدم آگے بڑھ کر بجلی کے ٹرانسفارمر کو بھی نہیں چھوڑا جو مصر میں ناگا حامبری کے مقام پر نصب تھا۔ اور اس علاقے میں کسانوں کے گھروں کو بجلی مہیا کرتا تھا۔ اس کی فوجی اہمیت کیا ہو سکتی ہے ؟ لیکن کچھ لوگوں نے ایسے حملوں کو نہایت مناسب قرار دیا تھا۔ دوسری جانب ہم لائیڈا ایئرپورٹ کو انتہائی مناسب، نمایاں اور فوجی نوعیت کا بہت ہی اہم نشانہ سمجھتے ہیں جسے جس وقت بھی ممکن ہو ہمارے حملوں کی زد میں ہونا چاہیئے۔

اسرائیلی تاریخ غیر مسلح عوام کے خلاف جارحیت اور بربریت کی تاریخ ہے۔ اسرائیلی نے اب تک جتنے قتلِ عام کئے ان کی طویل فہرست ہے۔ آپ کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ۱۹۴۸ء میں دیر یاسین کا قتلِ عام ان سینکڑوں وارداتوں میں سے ایک ہے جس کی بھیانک یاد ہمارے عوام کے ذہنوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ ہمیں یہ یقین ہے کہ آپ اس تشدد، —— خوف و ہراس، ناجائز قبضہ، دباؤ اور استحصال۔ اور انقلابی تشدد کے درمیان تمیز کر سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ لائیڈا ایئرپورٹ پر ہماری مہم اور اردن میں مشرقی گھور کی زرعی نہر کی تباہی کے درمیان ایک خطِ فاصل کھینچ سکتے ہیں۔ یا اگر آپ چاہیں تو بجائے اس مثال کے ابوزآبل کے مزدوروں پر خوفناک آتشیں بمباری یا مصر میں بوہر آل باقر کے مقام پر بچوں پر بمباری یا مقبوضہ فلسطین میں کفرِ قاسم میں کسانوں کا قتلِ عام اور جنوبی لبنان میں دیہاتیوں کا قتلِ عام —— آپ کسی بھی مثال کو زیرِ بحث لا سکتے ہیں۔

ایک مقبوضہ ریاست میں آپ فوجی اور شہری معاملات کے بارے میں گفتگو نہیں کر سکتے۔ اسرائیلی سوسائٹی ایک فوجی سوسائٹی ہے لازماً یہ شہری اور فوجی ملاپ پر قائم ہے۔ چنانچہ اس میں ڈھانچہ فوجی اور شہری تفریق کرنا ممکن بنا دیا ہے۔

شاید آپ اس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ اسرائیل میں ہر نوجوان شہری، خواہ مرد ہو یا عورت، ایک فوجی ہے۔ علاوہ ازیں اسرائیلی معاشرہ ایک ایسی قلعہ بند فوجی ریاست کی تشکیل کرتا ہے جہاں ہر فرد حالتِ جنگ میں ہے۔ اسرائیل میں ہر شہری پانچ سو امریکی ڈالر سالانہ ادا کرتا ہے تاکہ اس جنگ میں مالی طور پر حصہ لے سکے۔ یہ رقم اس رقم سے پانچ گنا زیادہ ہے جو ایک برطانوی شہری ادا کرتا ہے۔ چنانچہ آپ کس طرح یہ امید کر سکتے ہیں کہ ہم ایک فوجی اور شہری سوسائٹی میں فرق کر سکیں گے جبکہ صورتِ حال یہ ہو۔ بہر حال کوئی بھی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسرائیل میں کیا چیز فوجی نوعیت کی ہے اور کیا چیز شہری نوعیت کی۔

اس کے علاوہ آپ کے سوال کا تعلق ایک تصوراتی اور عمومی مسئلے سے ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ عملی سطح پر اس کا کوئی حل نہیں۔ مزید برآں آپ اس مسئلے کو بلیک میل کرنے کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں آپ سیاحوں کے ہونے والے نقصانات کے لئے تفکرانہ لہجہ استعمال کرتے ہیں۔ حقیقتاً ان نقصانات کا نشانہ بننے والوں کی وجہ سے ہمارے دل غمناک اداسیوں اور صدموں سے بھر گئے ہیں۔ لیکن ہم اس کے اسباب سے نہ تو انکار کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی حل تجویز کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کو اس کا اندازہ کرنا چاہیئے کہ جب ہم نے اپنا پروگرام طے کیا تھا تو ہم نے اسرائیلی سیاحت کے فروغ کے معاملات پر قطعی غور نہیں کیا تھا۔

ہم نے اسرائیل جانے والے سیاحوں کو بار بار واضح تنبیہ کی ہے کہ جنگ کے غبار میں اگر وہ اتفاقی طور پر کسی حادثے یا نقصان کا شکار ہوتے ہیں تو اس کی ذمہ داری خود ان پر عائد ہو گی۔ بے گناہ لوگوں کی موت سے ہمیں دلی صدمہ ہوا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر فرد اپنے ذہن میں ایک ہی سوچ رکھتا ہے اور وہ یہ کہ سزا کا اصل مستحق مجرم ہی ہونا چاہیئے۔ اور جو جرم میں شریک نہیں وہ مردن زدنی نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ بے گناہ

اسرائیلی معاشرہ فوجی معاشرہ ہے

لوگ ہمارے ہاتھوں زک نہ اٹھائیں ستمبر ۱۹۷۰ء میں تین سو پچاس ہوائی مسافروں میں سے کسی بھی فرد کے ساتھ غیر مناسب برتاؤ کیا گیا۔ اور نہ ہی کسی کو جسمانی اذیت پہنچائی گئی۔ لیکن اسرائیلی حدود میں ایک مسلح کارروائی کے دوران معاملہ قطعی مختلف ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں تمام تر الزام اُس پارٹی پر آتا ہے جو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں امن قائم ہو چکا ہے اور اس طرح وہ سیاحوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

دلیل کے طور پر ہم اگر یہ فرض کرلیں کہ اسرائیلی دشمنوں کے خلاف مزاحمت کی تمام کارروائیاں اس طرح انجام دی جائیں کہ اس سے شہریوں، غیر ملکیوں، سیاحوں، عورتوں اور بچوں کو کسی بھی قسم کا نقصان برداشت کرنا نہ پڑے۔ اور ان کے علاوہ بیرونی ممالک میں اسرائیلی مفادات یا فوجی ٹھکانے مثلاً ہوائی اڈے، طیارے، بندرگاہیں یا ریلوے متاثر نہ ہوں۔ اس صورت میں ہم آزادی کی ایسی جنگ لڑ رہے ہوں گے جو کہ ہمیں اپنے اصل مقصد سے دُور لے جائے گی۔ ہم مشرق کی سمت بڑھنے کے منصوبے بنا رہے ہونگے لیکن دراصل ہم مغرب کا رُخ کیے بیٹھے ہوں گے۔

سوال:۔ ہمیں ڈر ہے کہ ایک دن وہ آئے گا۔ جب لندن ایئرپورٹ پر تین مسافر اتریں گے۔ اپنا سوٹ کیس کھولیں گے، مشین گنیں نکال کر تمام لوگوں کو اپنے سامنے ڈھیر کردیں گے کیا اس میں کوئی مثبت اور سنجیدہ پہلو نظر آتا ہے؟۔

جواب:۔ اگر برطانیہ نے لندن پر قبضہ کرلیا ہوتا، تاکہ وہاں ایک نوآبادیاتی سوسائٹی قائم کی جاسکے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ امن کی باتیں کرتے اور سیاحوں کی حوصلہ افزائی کرتے تو کیا لندن ایئرپورٹ پر اس قسم کے کسی حادثے کے وقوع پذیر ہونے کی توقع نہ کرنا کیا حیرت کن بات نہیں ہوتی؟۔

سوال:۔ لیکن اس بے انتہا تشدد اور بے مقصد قتلِ عام۔ اس وحشناک بربریت اگر ہم یہ اصطلاح استعمال کرسکتے ہیں۔ گو اس کی انتہا کہاں ہے؟۔

جواب:۔ ہم اس قسم کی اصطلاحات کے استعمال کو پسند نہیں کرتے جو گھبراہٹ اور غلط طور پر تخلیق کی گئیں ہوں۔ مغربی پریس عموماً ایسی اصطلاحات تخلیق کرنے میں بہت مہارت رکھتا ہے۔ جس سے صرف حکمران طبقے کے مفادات کو تقویت پہنچتی ہے۔ کیا آپ لائیڈا ایئرپورٹ کی کارروائی کے بعد نکسن کے اس خط کے حوالے کو پسند کریں گے جو انہوں نے قاہرہ بھیجا تھا اور جس میں اخلاق سے گری ہوئی غیر شائستہ زبان استعمال کی تھی۔ کروڑوں ویت نامی شہری اور فوجی جو روزانہ نکسن کے بموں سے ہلاک ہو رہے ہیں کیا اُس کے ضمیر کو نہیں جھنجھوڑتے اور جب کوئی سامراجی تشدد کا مقابلہ انقلابی تشدد سے کرنے کے لئے کمر بستہ ہو جاتا ہے تو وہ فوراً اپنے آپ کو انسانیت کے محافظ کے طور پر پیش کر دیتا ہے۔

تشدد ہے کیا؟ —— ہمارا یقین ہے کہ سیاسی ذرائع یا تو راست اور حق پر مبنی ہوتے ہیں، یا پھر مکر و فریب پر —— ہم صرف مورل MOROL پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم تشدد اس لئے کرتے ہیں کہ انصاف کو حاصل کرنے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ آپ بربریت کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ ہمیں ان اصطلاحات کے مفہوم کی گہرائی میں جانے دیجئے۔ ہم اس مفہوم کو ثابت کرسکتے ہیں۔ آپ کے بہت سے اخبارات میں آج یہ خبر چھ سطروں میں شائع ہوئی ہے۔ "رہوڈیشیا میں کان کے ایک دھماکے ساڑھے چار سو کان کن ہلاک ہوگئے" کیا آپ ان کی افسوسناک موت کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟ ان کے قاتل کون تھے؟ ہلاک ہونے والوں میں بیشتر وہ سیاہ فام باشندے ہیں جو موزمبیق کی پرتگالی نوآبادی میں غلام بنا کر لے جائے گئے تھے۔ ان کی محنت کرنے کی تمام صلاحیتیں سفید فام رہوڈیشی سرمایہ داروں کو بیچ دی گئی ہیں۔ جو بلا کسی دلیل کے ان کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ زمین کی سخت تہوں اور چٹانوں کے نیچے مر گئے اور اس واقعہ پر آپ کی توجہ اخبار کی صرف چھ سطروں میں مرکوز ہوگئی۔ آپ اس وقت آنکھوں میں آنسو بھر کر چلاتے ہیں جب حریت پسند اور نوآبادیت کے ظلم میں دبا ہوا انسان اپنے استحصال زدہ علاقے سے قابضوں کے منحوس قدم قدم کاٹ پھینکنا چاہتا ہے۔ جو اس کے ملک اور مستقبل کو لوٹتے جا رہے ہیں۔ اور جب وہ مظلوم دنیا کے سامنے ہلکے سے اُف کرتا ہے کہ اتنا تو حق بہرحال اُسے ہے۔ تو آپ انسانیت کی دہائی دینے لگتے ہیں۔

آپ بربریت اور خونریزی کی بات کرتے ہیں؟ دراصل عوام جنہیں اُن کے اپنے گھروں سے محروم کیا گیا ہے جن کو وحشیانہ طور پر لوٹا گیا ہے، ایک ایسی حالت میں اپنے آپ کو پاتے ہیں جس میں انہیں اپنی حفاظت خود ہی کرنا پڑتی ہے۔ اس کا ہر عمل زندگی یا موت کا عمل ہے۔ یہ بقا کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ تشدد خواہ کتنے ہی گہرے اثرات مرتب کرتا ہے، اپنا تعلق زندگی اور اس کی بقا سے پیدا کرتا ہے اور اس کا مقصد انصاف کیلئے جدوجہد ہے۔

سوال:۔ لیکن ایئرپورٹ اور ہوائی جہاز ہی کیوں؟ —— کیا یہ بین الاقوامی ٹرانسپورٹ کے نظام کو درہم برہم کر دینے کی کوشش نہیں؟۔

جواب:۔ دوا تجویز کرتے وقت مرض کی تشخیص بہت ضروری ہے۔ انقلابی نوعیت کی جدوجہد رفتہ رفتہ انقلاب کے مختلف قسموں کے طریقہ کار سے ابھرتی ہے۔ ان قسموں کی نشوونما ہوتی ہے۔ اور جدوجہد میں شریک لوگ اپنے مخصوص حالات کے تحت انہیں اختیار کر لیتے ہیں فلسطینی عوام سے آپ کیا توقعات وابستہ کرسکتے ہیں جنہیں اُن کی زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ کیا دشمن یہ سمجھتا ہے کہ فلسطینی عوام کو ان کے گھروں سے بے دخل کرکے وہ انقلاب کو عوام سے دور رکھا جاسکتا ہے اور اس طرح روزانہ کے انقلابی مہمات سے محفوظ رہا جاسکتا ہے؟۔

اگر فلسطینی عوام اپنے گھروں میں رہتے اور فوجی اور معاشی قوت سے فلسطین کو ایک کلاسیکل نوآبادی بنا دیا گیا ہوتا تو کوئی بھی فلسطینی انقلابی لائیڈا ایئرپورٹ پر حملے کا تصور بھی نہ کرسکتا۔ زیورچ یا ایتھنز میں اسرائیلی جہاز پر فائرنگ یا چار جہازوں کو اغوا کرکے اردن کے صحرا میں اتارنے کا خیال تک ذہنوں میں نہ آتا تھا۔ غزہ میں ہماری جدوجہد کی شکل قطعی مختلف ہے۔ وہاں ہمارے لڑاکا ساتھیوں نے خفیہ سرنگوں کا ایک دفاعی نظام تشکیل دیا ہے۔ دشمن یہ بات اچھی طرح جان چکا ہے کہ ہمارے ساتھیوں کی سرگرمیاں اس قدر عروج پر پہنچ چکی ہیں کہ اب انقلاب ہمیشہ زندہ رہے گا اور جاری رہے گا۔ یہ طریقہ اور اصول کس نے ایجاد کیا؟ یقیناً یہ عوام کی اجتماعی انقلابی سوچ کا نتیجہ ہے جو حالات کے مطابق انقلابی جدوجہد کو اختیار کرتے ہیں۔ اور فاشسٹ طرز کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کی تمام صلاحیتیں رکھتے ہیں۔

لیکن غزہ میں استعمال کئے جانے والے طریقوں کو ہم دوسری جگہوں پر استعمال نہیں کرسکتے دشمن کے مواصلاتی مراکز اور ایئرپورٹ پر حملے دراصل اُن ضرورتوں کے تحت شروع کئے گئے ہیں جو ہمارے خلاف دباؤ کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔

سوال:۔ جاپانی اس حملے میں کیوں شریک ہوئے؟۔ عربوں نے یہ مہم خود کیوں نہ سر کی؟

جواب:۔ یہ مہم سینکڑوں جنگجو بہادروں کے اتحاد کا مظہر تھی۔ جاپانی کامریڈوں نے رضاکارانہ طور پر اس مہم میں شرکت کی جو عرب حریت پسندوں کے بس سے باہر تھی کیونکہ اسرائیلی



سامراجی تشدد کا جواب

انقلابی تشدد سے ہی دیا جا سکتا ہے

عرب مسافروں کی خواہ وہ مقبوضہ علاقوں سے باہر جا رہے ہوں یا آ رہے ہوں، کڑی نگرانی کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ جاپانی کامریڈوں نے نہایت ہی نمایاں کارنامہ انجام دیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عرب کامریڈ وہاں موجود نہیں تھے حقیقت یہ ہے مقبوضہ علاقے میں ہماری تنظیم کے پانچ سرگرم کامریڈوں نے اپنی ذمہ داریوں کو توجہ اور ذہانت سے پورا کیا۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ جاپانی کامریڈوں کے لئے ہم کو کامیابی سے ہمکنار کرنا مشکل ہو جاتا اگر یہ (عرب) کامریڈ اپنی ذمہ داریاں کامیابی سے پوری نہ کرتے۔

مزید برآں جاپانی رضاکاروں کی اس مہم میں شرکت سامراجی زنجیر کے اس حصے کے خلاف ہماری جدوجہد کی بین الاقوامی افق پر ایک اتحاد کی ایک علامت ہے۔ یہ پہلا واقعہ نہیں کہ غیر عرب لوگوں نے ہماری مہماتی سرگرمیوں میں حصہ لیا ہو۔ بقول آپ کے بے شمار غیر ملکوں نے ہمارے جنگ جوؤں کے شانہ بشانہ جام شہادت نوش کیا ہے۔ ایک فرانسیسی شہید کی یاد ہمارے بے شمار لوگوں کے ذہنوں میں اب بھی تازہ ہے جس کا تعلق "الفتح" سے تھا۔ ہم آپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ لائیڈا آپریشن میں شریک لوگوں کا تعلق ایسے گروپ سے تھا جس کا نام شہید پیٹرک آرجیولو، کے نام پر رکھا گیا تھا جو NICARAGUAN شہری تھا۔ یہ کوئی خفیہ بات نہیں کہ اسرائیلی قید خانوں میں جہاں حریت پسندوں کو انسانیت سوز طریقوں سے اذیت پہنچائی جاتی ہے ان میں سے پانچ غیر ملکی ہیں۔

سوال:۔ شاید جس چیز نے سب سے زیادہ توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ اس مہم میں جاپانیوں نے حصہ لیا۔ امریکیوں کے ذہن میں اب بھی ماضی کی بہت سی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ جاپانی کامی کازی KAMI KAZI پرل ہاربر اور بحر اوقیانوس کی جنگیں۔؟

جواب:۔ جی ہاں — لیکن ایک اہم فرق بھی ہے بحر اوقیانوس اور پرل ہاربر کے جاپانی کامی کازی KAMI KAZI در اصل فاشسٹ آئیڈیولوجی کے تحفظ کے لئے خودکشی پر مبنی مہم چلا رہے تھے اور اس کی بنیاد جاپانی نسل کی جارحیت اور ہم تشدد پسندانہ حکمت عملی پر تھی۔ ہمارے کامریڈ اس جذبے سے تضاد رکھتے ہیں یہاں انہوں نے فلسطینی عوام کے لئے اپنی جانیں قربان کر دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ پرل ہاربر کے بعد دنیا میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اب بین الاقوامی انقلابی سامراج کے خلاف انقلاب کے شانہ بشانہ صف آرا ہیں۔ اور جہاں کہیں بھی یہ انقلاب ظہور پذیر ہوتا ہے یہ بہادر کامریڈ وہاں موجود ہوتے ہیں۔

سوال:۔ کیا موت آپ کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی؟

جواب:۔ بے شک اس کے معنی بہت وسیع ہیں۔ اہم چیز یہ جاننا ہے کہ کیوں؟ انقلابی عمل کے دائرے میں خود ایثاری در اصل زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں سے سمجھنے اور زندگی کو انسانیت کے لئے سود مند بنانے کے عزم و جدوجہد کا اظہار ہے۔ ایک شخص کے لئے زندگی سے پیار در اصل عوام کی زندگیوں سے پیار ہے۔ اور اس بات سے انکار ہے کہ عوام کی زندگی غربت افلاس، مشکلات کے طویل اور ہمیشہ جاری رہنے والے دور کا نام ہے۔ چنانچہ زندگی سے واقفیت ایک معاشرتی حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے جو لٹا کا جنگ بازوں کو یہ سمجھانے کے قابل ہوتی ہے کہ خود ایثاری عوامی زندگی کو آزادی سے ہمکنار کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ زندگی سے قریبی تعلق کا زیادہ سے زیادہ اظہار ہے۔

سوال:۔ اسرائیلی ترجمان کا کہنا ہے کہ آپ جاپانیوں کو اس لئے استعمال کر رہے ہیں کہ آپ خود اسرائیل سے مقابلے کی قوت نہیں رکھتے۔؟

جواب:۔ بے وقوفی پر مبنی یہ ضد در اصل صیہونی آئیڈیولوجی کی نسل پرستی کے خطوط سے ہم آہنگ ہے۔ ہم دشمن سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ دوستی کے عمیق معنوں کو سمجھ سکے۔ خاص طور پر جبکہ وہ ان خطوط پر سوچ رہا ہو۔ اگر وہ شخص جو یہ دعویٰ کر رہا ہے۔ اپنی کہی ہوئی بات سے مطمئن ہے تو پھر وہ کیوں ملٹری مشینری کا طلب گار ہے، پھر وہ کیوں امریکی سامراج کو اپنی پشت پناہی کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ پھر وہ کیوں ہمارے شہریوں کو قیدی بنانا چاہتا ہے۔ جوں جوں تسلط کے وقت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پولیس اور فوج کی تعداد اور ان کی کارکردگی میں اسرائیلی طرز زندگی کے مطابق اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اور یہ اضافہ اسی وقت ممکن ہے جب تک کہ فلسطینی اور عرب عوام میں انقلابی صورتحال کی بڑھتی ہوئی شدت کے خلاف خوف نہ پیدا کیا جائے۔

بے شمار موقعوں پر ہم دشمنوں پر یہ دباؤ ڈال چکے ہیں کہ وہ اس قسم کے بیانات کو عملی طور پر واپس لیں۔ ایک دن ہم دباؤ ڈالیں گے کہ دشمن یہ بیان بھی واپس لے۔

سوال:۔ شاید آپ نے اس بات کو محسوس کیا ہو کہ بیشتر غیر ملکی اخبارات نے اس مہم کے خلاف رائے ظاہر کی اور شدت سے اس پر تنقید بھی کی۔ کیا آپ عالمی رائے عامہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے؟

جواب:۔ کیا ایسا ہے؟ — ہم نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ان بڑے بڑے مغربی اخبارات نے اس مہم کے بعد، سابقہ رویے میں کوئی نئی تبدیلی پیدا کی ہو۔ یقیناً ہم نے یہ بات محسوس کی ہے کہ ان اخبارات نے اسرائیل کے حق میں اور عربوں کے مقاصد کی سچائی اور اہمیت پر شک و شبہ ظاہر کرنے کے لئے جو جگہ مہیا کی تھی، اس مہم کے بعد اس میں مزید اضافہ ہو گیا ہے گزشتہ بیس سال میں ہمارے اندازے کے مطابق ان کے رویے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی ہے۔ ہم کسی بھی صورت یہ محسوس نہیں کر سکے ہیں کہ اخبارات مثلاً نیویارک ٹائمز، اکنامسٹ، ٹائم، نیوز ویک، ایکسپریس، انٹرنیشنل ہیرالڈ، ٹریبون لاس اینجلس ٹائمز اور بہت سے دوسروں نے فلسطینی عوام کی حمایت میں آواز بلند کی تھی۔ جبکہ فلسطین کی قومی جدوجہد شہراہ کا شکار تھی یا جب فدائین کی سرگرمیاں شروع ہوتی تھیں یا جب اردن میں فلسطینی مزاحمت کو کچلا جا رہا تھا۔ کم از کم ہم نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ یہ اخبارات جنہیں آپ "بین الاقوامی رائے عامہ" کا نام دیتے ہیں کبھی ہمارے ساتھ بھی رہے ہوں یا ہمارے مسائل سے کبھی ہم آہنگی ظاہر کی ہو۔ چنانچہ ان کی آرا غیر اہم ہیں ہر گز نہیں چونکایا اور نہ ہی یہ حیران کن بات تھی۔

جب فلسطینی عوام خاموش، فراموش کردہ اور غربت کی اندھی ناکیوں میں بے سہارا چھوڑ دیئے گئے تھے۔ ہم نے کبھی ان اخبارات کو دو آنسو بہاتے نہیں دیکھا۔ یہ اخبارات ایک جانب مخصوص قسم کی جدوجہد کے خلاف نہیں ہیں اور دوسری جانب دوسری قسم کے بھی خلاف نہیں ہیں۔ نہیں — یہ لازمی طور پر قومی آزادی کے مقصد کے خلاف ہیں۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ انہیں وہ تمام تجارتی آسائشیں میسر ہیں جو انہیں سرمایہ مہیا کرتی ہیں اور ان کا تحفظ کرتی ہیں وہ آخری لمحہ تک اپنے اس انداز فکر کو تبدیل نہیں کریں گے اور اس وقت تک فلسطینی عوام کی

ہزاروں ویت نامیوں کی موت پر

دنیا کا ضمیر کیوں خاموش رہتا ہے؟

مخالفت کرتے رہیں گے۔ جب تک کہ عوام ہتھیار ڈالنے اور غلامی برداشت کے لئے تیار نہیں ہوتے وہ ان عوام کو اسوقت تک خراج تحسین پیش نہیں کریں گے اور اعتماد نہیں گے۔ جب تک کہ وہ اپنی شکست تسلیم نہیں کر لیتے۔ صرف اسی وقت یہ عوام، مہذب، ذہین، باتدبیر اور معقول سمجھے جائیں گے۔

اب ایسے اخبارات رہ جاتے ہیں جو بائیں بازو کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ اخبارات ہمارے لئے اہمیت کے حامل ہیں۔ ہم ان سے صرف ایک گزارش کریں گے۔ اور وہ یہ ہے کہ سامراجی ذہنوں کے کئے ہوئے مکر آمیز فیصلوں کا احتیاط کے ساتھ فلسطینی مزاحمت اس کی تھیوری اور اس کے نشو ونما کے مختلف ادوار کی روشنی میں تحریر کریں۔ اور کلی طور پر تخیلاتی انداز پر نہ سوچیں۔ ہم ان سے صرف اتنی ہی توقعات وابستہ کر سکتے ہیں۔

ان دو قسم کے اخبارات کے درمیان بے شمار غیر جانبدار صحافی بھی ہیں جو اپنے آپ کو عرب مقاصد کا ہمدرد کہتے ہیں۔ ان میں سے بے شمار لوگوں نے بین الاقوامی فریب کے جال میں پھنسنے میں پس و پیش ظاہر کیا۔ جیساکہ توقع کی جاسکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں کی قومی تحریک کی حمایت کی حدیں وہاں ختم ہو جاتی ہیں جہاں ایک طرف ان کے ذاتی مفاد کار فرما ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ قارئین، اور پروپیگنڈہ ایجنسیوں کی جو انہیں باقاعدگی سے روپیہ مہیا کرتے ہیں۔ دانشورانہ بلیک میل کا نشانہ بن چکے ہیں۔

لوگوں کے اس بیابان میں کچھ آوازیں ایسی بھی سنائی دیتی ہیں جن میں خوف، مکر و فریب اور چالبازی کا عنصر شامل نہیں۔ مثلاً LATRIB UNE DUGENEVE میں شائع ہونے والے مضامین جن میں مغربی پریس کی مکر و فریب کی پالیسی کا پردہ چاک کیا گیا ہے اس زمرے میں بائیں بازو کی طرز فکر کی ترجمانی کرنے والے اخبار TEMOIGNAGE CHRETIENNE کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے فیصلوں کی کسوٹی ہمارے عوام ہیں۔ اس آپریشن کے بارے میں عوام میں معمولی نوعیت کی رائے قائم ہوئی ہے۔ لیکن کچھ حلقے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس مہم کے بارے میں قطعی مختلف نوعیت کی رائے قائم کی ہے۔ ان میں ایک طرف شاہ حسین اور شیخ محمد علی الجبار ہیں جو مغربی کنارے پر ہیبورن (HABORN) کے میئر ہیں۔ ان کے نقش قدم پر مصری روزنامے الاہرام کے ایڈیٹر ہیکل بھی گامزن نظر آتے تھے۔ جنہوں نے مغربی پریس کے دائیں بازو کی مفاد پرست فکر کو اپنایا ہے اور جنہوں نے ہماری مہم پر ایک غیر ملکی سیاح کے نقطۂ نظر کے مطابق تنقید کی۔ دوسری جانب ہمارے عوام ہیں جو اس غلط طرز عمل کے اثرات سے قطعی محفوظ ہیں۔

سوال: کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ اس قسم کی مہمات کی مدد سے فلسطین واپس جانے کا راستہ صاف کر سکتے ہیں؟

جواب: مغرب ہمیشہ یہ تصویر کھینچتا رہا ہے کہ عرب انقلاب کا مقصد واضح نہیں ہے۔ اور اس کی تعمیر غیر حقیقی اور غیر مؤثر خوابوں، تخیلات اور تصورات پر کی گئی ہے۔ یہ باتیں دور دور تک پھیلانے کا مقصد شاید اس مہم کا ایک حصہ ہے جو تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ممالک میں آزادی کی تحریکوں کے خلاف جاری ہے۔ تاکہ وہ امید کا دامن چھوڑ دیں۔ مزید برآں یہ کہ اس طرح ان کی پس ماندہ غیر حقیقت پسندی اور ساتھ ساتھ نو آبادیاتی حقیقت کو پیش کیا جائے۔

ہرگز نہیں ــــ ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ مہم یا اس جیسی سینکڑوں مہمیں فلسطین واپس جانے میں ہماری کوئی مدد کر سکیں گی۔ ہم یہ سوچتے ہیں اور نہ اس کا تصور کرتے ہیں کہ کسی بھی قسم کی فوجی مہم فلسطین کی آزادی میں معاون ہو سکتی ہے ہم نے اپنی منصوبہ بندی ان مفروضات کی بنیاد پر نہیں کی کہ فلسطین کو آزاد کرانے کے لئے جنگ کوئی جادوئی عمل ہے، یا یہ ایک فوری پکنک کا معاملہ ہے، نہ ہی یہ ایک معجزہ ہے جو ایک خاص شام کو ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔

ہم ایک طویل، مشکل اور دشوار گزار مارچ میں ہیں۔ جسے ہم طویل عرصے کی مقبول قومی جنگ کہتے ہیں۔ اپنی حیثیت سے خوب واقف ہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم اب بھی ابتدائی مراحل میں ہیں جو جنگ کی جانب راستہ بناتے ہیں۔

ہم اس سے بھی آگاہ ہیں کہ فلسطینی تحریک قومی آزادی کس قدر قومی جمہوری عرب انقلاب سے مطابقت رکھتی ہے اور ہمارے علاقے میں کئی عرب حکومتوں کی پالیسیاں کس قدر سامراج سے تعلق رکھتی ہیں۔

ہم عرب انقلاب اور تیسری دنیا میں قومی آزادی کی تحریکوں، سوشلسٹ ممالک اور سرمایہ دارانہ ممالک میں ابھرنے والی پرولتاری فکر کے درمیان تعلق کو بھی سمجھتے ہیں۔ ہم اسرائیل کی فوجی پائیداری اس کی معاشرتی برتری، اور سامراج اور عرب رجعت پسندوں سے اس کے تعلقات کے بارے میں بھی ناواقف نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ آپ کا سوال غلط خیالات سے ابھرا ہے۔

ہم اس موقعے پر انقلاب کا ایک مضبوط اور منظم ڈھانچہ تیار کرنے میں مصروف رہنا چاہتے ہیں۔ ایسی انقلابی تنظیم جو اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے قابل ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ مقاصد مسلح جدوجہد کے عمل سے حاصل ہو سکتے ہیں اور اس کی وجوہات فلسطینی عرب اور بین الاقوامی سطح پر سیاسی بھی ہیں اور فوجی بھی۔

ہم جانتے ہیں کہ ایک خاص مدت میں بے شمار انقلابی مہمات، ایک بڑے اور اعلیٰ عمل کی بنیاد مہیا کریں گی۔ اس مرحلے پر دشمن کے کیمپ کی تمام پارٹیاں اس تصور میں گم ہیں کہ مزاحمت ختم ہو جائے گی یا پھر ایک بڑے نقصان کا سامنا کرے گی۔ وہ اس مفروضے کو ہتھیار ڈلوانے کی پالیسی کی تکمیل کے لئے استعمال کر رہے ہیں خواہ یہ مکمل شکست ہی کیوں نہ ہو جیساکہ شاہ حسین کے متحدہ عرب سلطنت کے منصوبے اور مغربی کنارے پر میونسپل انتخابات سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس پیچیدہ صورت حال میں ہی لائیڈ آپریشن کی تکمیل ہوئی جسے مذکورہ اور تمام حقائق کے پس منظر میں سمجھا جاسکتا ہے۔ آزادی کی جنگ بہرحال پاپولر آرمی لڑے گی۔ فلسطینی اور عرب دونوں پاپولر آرمی بے حد منظم ہے اور اس کی رہنمائی ایک انقلابی پارٹی کرتی ہے اور دنیا کی تمام انقلابی قوتیں اس کے ساتھ ہیں۔

یہ وہ چیز ہے جس کے لئے زیادہ وقت، لامتناہی عمل اور کوششوں کی ضرورت ہے۔ اس کا حصول ایک مختصر مدت میں ناممکن ہے۔ نہ ہی ساکت بیٹھ کر اور انتظار کی کیفیتوں سے گزرنے کے بعد حاصل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ہتھیار ڈالنے سے۔ اس کا حصول مہمات کے لگاتار اور مسلسل سلسلے سے ہی ہو سکتا ہے جو دشمن کی نسلی بالادستی کے تصور اور آخری فتح کے بارے میں اس کی پیشین گوئیوں کے مرکز کو نشانہ بنا سکتی ہیں۔ یہ عمل ہمارے عوام کی امید وں کو عظیم انقلاب اور براہ راست مقابلے سے وابستہ کرتا ہے۔ اس سے دنیا پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسرائیلی قبضہ کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا اور اس سے لاتعلق رہنا اور علاقہ میں تبدیلیوں کو قدرتی تصور کرنا، دراصل جارحیت میں شرکت ہی کا ایک پہلو ہے اور یہ ایک جرم ہے کہ دوسروں کو یہ کہہ کر بہکایا جائے کہ علاقے میں امن کا دور دورہ ہے۔

۸ جنوری تحریک

- فرشتہ سیرت لوگ کفن چور ثابت ہوئے
- گورمانی پولیس کی پک اپ میں بیٹھ کر فرار ہوا

جنوری تحریک پاکستان کے مظلوموں کی جدوجہد کا سنگِ میل

شبّو اعظمی

پاکستان میں طالب علم تحریک تنظیم اور جدوجہد کے ایک طویل اور لامتناہی سلسلہ سے عبارت ہے۔ اس عظیم الشان رزمیہ میں جہاں ایک طرف فتح و نصرت، ایثار و قربانی، محنت و جانفشانی عزم و استقلال، جدوجہد و پامردی اور ہمت کے شناوروں کی کہانیاں ہیں تو دوسری طرف ناکامی و ناتجربہ کاری اور انتہاپسندی کی داستانیں ہیں۔ اور کالی بھیڑوں کی اندرونِ پردہ تحریک کو سبوتاژ کرتے اور چند کھنکتے ہوئے روپہلی سکوں کی تھاپ پر والہانہ رقص کرتے ہوئے پیکر بھی نظر آئیں گے۔

لیکن تحریک کا سب سے واضح پہلو یہ ہے کہ اس نے جدوجہد کے ابتدائی مرحلے ہی میں تعینِ سمت کا اظہار کر دیا تھا کہ ان کی جدوجہد محنت کش عوام کی عظیم تر جدوجہد سے علیحدہ نہیں۔ اس نے منفی اقدار کی نفی کرتے ہوئے مثبت اقدار کو اپنانے کی سعی کی اور ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ پاکستان کی طالبِ علم برادری نے ایک نیم نوآبادیاتی نظام میں اپنے کردار کو سمجھتے ہوئے شعوری اور عملی طور پر اپنے طبقاتی فریضے کو پورا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔

قیامِ پاکستان کے بعد ایک عرصہ تک جذباتیت کی دھند لوگوں کے ذہن و فکر پر مسلط رہی۔ لوگ اربابِ حکومت سے مکمل مایوس نہیں ہوئے تھے بلکہ انھیں یہ توقع تھی کہ جلد ہی انصاف پر مبنی ایک خوشحال معاشرے کا قیام عمل میں آجائے گا۔ دکھ درد کے دن ختم ہوجائیں گے۔ غلامی کی تمام یادگاروں کو دفن کر دیا جائے گا۔ اور آزادی کے ثمرہ سے محنت کش عوام بھی مستفید ہوں گے۔

لیکن نیند کا فسوں ابھی ٹوٹنے بھی نہ پایا تھا کہ یہ تمام حسین خواب بکھرنے لگے۔ لوگوں نے اپنے آپ کو لاتعداد مسائل میں گھرا پایا۔ کل اور آج میں انہیں کچھ بھی فرق نظر نہ آیا، بلکہ انھوں نے نت نئے مسائل کا اضافہ ہی پایا۔ اس کا شعوری احساس سب سے پہلے طلبہ کو ہوا۔ خصوصاً مغربی پاکستان میں طلبہ کی جنوری تحریک پہلی عوامی تحریک تھی جس نے حکومت سے ٹکر لی اور پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔

گو اس سے قبل بھی طلبہ نے اپنے آپ کو منظم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ ایک طالب علم نے جو کہ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں کام کر چکے تھے، اپنے تجربہ کو بروئے کار لاتے ہوئے ترقی پسند طلبہ کو منظم کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ ان کی کوششوں سے آرام باغ میں طلبہ کا ایک عظیم الشان کنونشن منعقد ہوا۔ جس میں سہروردی صاحب بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوئے۔ بڑی دھواں دار تقریریں ہوئیں۔ مستقبل کے منصوبے بنائے گئے۔ اور آل پاکستان اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن بات اس سے آگے نہ بڑھ سکی۔

ویسے اس سے قبل بھی کچھ تنظیمیں قائم ہوچکی تھیں۔ لیکن ان کی نوعیت اس قسم کی تھی کہ وہ طلبہ کے حقوق کی جدوجہد میں کامیابی حاصل نہ کر سکتی تھیں۔ ان کا کام حکومت کی جی حضوری کرنا، اس کی ہاں میں ہاں ملانا یا پسِ پردہ رہ کر طلبہ تحریک کو سبوتاژ کرنا، ان کو مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کرنا اور جیالے طالب علم ساتھیوں کی مخبری کرنا تھا۔

صحیح معنوں میں مغربی پاکستان میں طالب علم تحریک کا آغاز جنوری تحریک سے ہوتا ہے، جو طالب علموں کی پہلی شعوری کوشش اور اپنے تنظیمی اتحاد کا مظہر تھی۔ اس تحریک کا ایک دوسرا اور سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ طلبہ اور عوام کا پہلا متحدہ محاذ تھا۔ طلبہ کو مزدوروں، دانشوروں اور عوام کے دوسرے طبقات کی حمایت حاصل تھی۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تحریک اچانک ابھری تھی۔ اس کے پسِ پشت نہ طلبہ کی تنظیم تھی اور نہ ہی اپنے مسائل کا شعوری احساس۔ اس سلسلہ کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پولیس فائرنگ کی تحقیقات کے لئے جسٹس ولی محمد لیانی کی نگرانی میں مسٹر ایچ۔ ٹی رینڈ اور فیاض علی ایڈووکیٹ جنرل پر مشتمل جو ٹریبونل میں تھا اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ ۵ جنوری ۵۳ء کو مچھ جیل کوئٹہ میں راولپنڈی سازش کیس کے ملزمین کو سزا دی گئی تھی جس میں سجاد ظہیر، میجر اسحاق، فیض احمد فیض اور ظفر اللہ پوشنی وغیرہ شامل تھے۔ لہٰذا کمیونسٹوں نے ۶ جنوری کو ڈی۔ جے کالج میں ایک میٹنگ کی اور وہاں انھوں نے طالب علموں کو بھڑکانے اور ہنگامے کرانے کا پروگرام بنایا، تاکہ ملک میں انارکی اور بدامنی پیدا کی جائے۔ اور اس پروگرام کے مطابق ۷ جنوری کو جلوس نکالا اور وزیرِ تعلیم کی کوٹھی پر گئے جہاں پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ دوسرے دن اس کے ردعمل میں دوبارہ جلوس نکلا۔ ٹریبونل نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ تمام ہنگامے کمیونسٹوں کے منصوبے کے تحت عمل میں آئے اور اس میں غیر ملکی سازشوں کا ہاتھ ہے۔

ٹریبونل کے موقف کی تائید یا اختلاف ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ عوام اس کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں، لیکن بعض ذہنوں میں جو یہ سوال پیدا ہو رہے ہیں کہ جنوری تحریک ایک اتفاقی ابھار تھا۔ اس کے پسِ پشت کوئی تنظیم نہیں تھی اور نہ ہی طلبہ کو اپنے مسائل کا شعوری احساس تھا، اس کی وضاحت ضروری ہے۔

اسلامی جمعیت طلبہ نے جنوری تحریک کی مخالفت کی تھی

دراصل جنوری تحریک کا پہلا بنیادی پتھر اس وقت رکھا گیا تھا جب کہ ۱۱ر اکتوبر ۵۲ء کو ترقی پسند طلبہ کو منظم کرنے کے لئے تھیوسوفیکل ہال میں انجمن جمہوریت پسند طلبہ (ڈی ایس ایف) کا قیام عمل میں آیا۔ اس اجلاس میں واضح طور پر اس کا اعلان کیا گیا کہ نام نہاد طالب علم رہنما اور تنظیمیں حصولِ مطالبات کی جدوجہد کے لئے اتحاد پر آمادہ نہیں، لہٰذا طلبہ کو آپس میں ایک مضبوط تر اتحاد کرنا ہوگا۔ اجلاس نے اعلان کیا کہ وہ رنگ و نسل اور مذہب کی بناء پر طلبہ کو تقسیم کرنے کے قائل نہیں بلکہ تمام طلبہ کے مسائل ایک ہیں اور انھیں مل کر جدوجہد کرنا ہوگی۔ اس سلسلہ میں ان میں جو نفاق ڈالتے ہیں، وہ طالب علموں کے دشمن ہیں۔ اجلاس نے کہا کہ طلبہ میں اتحاد صرف نعرے لگانے یا زبانی اقرار سے نہیں ہوگا، بلکہ جدوجہد کے دوران مضبوط ہوگا۔ حقیقی اتحاد ہمیشہ جدوجہد کے دوران عمل میں آتا ہے۔

تنظیم کے قیام کے بعد مختلف تعلیمی اداروں میں طلبہ کو منظم کرنے اور ان میں اپنے مسائل کا احساس دلانے کے لئے سرگرمی سے کام شروع کر دیا گیا۔ ان کو یہ احساس دلایا گیا کہ ان کا مضبوط اتحاد اور شعور ان کے مسائل کا حل ہے۔ اس سلسلہ میں ڈی۔ ایس۔ ایف نے مختلف کالجوں کی یونینوں کو بھی آمادہ کیا کہ وہ اس کے ساتھ اتحادِ عمل کرتے ہوئے طلبہ کے مسائل حل کرانے کی جدوجہد میں شریک ہوں۔ انجمنِ جمہوریت پسند طلبہ اور انٹر کالجیٹ باڈی کے علاوہ گرلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن، پرائیویٹ اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور ہائی اسکول اسٹوڈنٹس فیڈریشن بھی جدوجہد میں اُکی شریک تھیں۔

۲۵ر نومبر کو ان تنظیموں نے یوم مطالبات منایا، تاکہ حکومت تک اپنے مسائل پہنچا سکیں۔ اور اسے احساس دلائیں کہ طلبہ متحد ہو چکے ہیں۔

طلبہ نے جو مطالبات پیش کئے وہ یہ تھے۔

۱۔ ڈو میڈیکل کالج کی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری تسلیم کی جائے۔

۲۔ چھ ماہ کی یکمشت فیس لینے کے بجائے ایک ماہ کی فیس لی جائے۔

۳۔ فیسوں میں ۳۳ فیصد کمی کی جائے۔

۴۔ تعلیمی اداروں اور اقامت گاہوں میں اضافہ کیا جائے۔

۵۔ اردو کالج اور اسلامیہ کالج شبینہ کلاس کو بند کرنے کا حکم واپس لیا جائے۔

۶۔ غریب اور مستحق طلبہ کو حکومت وظیفے اور امداد دے۔

۷۔ دستور میں نوجوانوں کے حقوق کی ضمانت دی جائے۔

۸۔ فری اسکالرشپ پانے والے طالب علموں سے یونیورسٹی کے امتحانات کی فیس نہ لی جائے۔

۹۔ بورڈ اور یونیورسٹی کے عام امتحانات کے بعد ضمنی امتحانات کا طریقہ رائج کیا جائے۔

لیکن بجائے اس کے کہ اربابِ حکومت طلبہ کے ان جائز مطالبات حل کرنے کی کوشش کرتے، ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس سلسلہ میں طلبہ کے وفود بارہا وائس چانسلر اور وزارتِ تعلیم کے افسرانِ اعلیٰ سے ملتے رہے لیکن یہاں بھی شانِ بے نیازی برتی گئی۔ اور الٹا طالب علموں کے اتحاد کو توڑنے کے لئے سازشوں کے جال بننے شروع کر دیئے گئے۔ کچھ طلبہ کو خرید لیا گیا۔ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اپنی بزرگی کا دامن چاک کر کے "ابا حلیم" اے۔ بی حلیم بن گئے۔ انھوں نے متوازی طلبہ تنظیم نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے قائم کر دی۔ اے۔ بی حلیم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے موجودہ دائیں بازو کی مزدور تنظیم کے ایک رہنما معیز صدیقی اور پی۔ آئی۔ اے کے ایک موجودہ اعلیٰ افسر قمر الزماں اور عظمت اللہ نے جو کہ اس وقت طالب علم تھے، بھی اپنے کرتب دکھانے شروع کر دیئے۔ اسلامی جمعیتِ طلبہ اور دیگر نام نہاد تنظیمیں بھی حرکت میں آ گئیں۔ طلبہ کی نمائندہ تنظیم کو غیر ملکی سازش کی پیداوار قرار دیا گیا اور انھیں کمیونسٹوں کا آلۂ کار قرار دیا گیا۔ طلبہ کے اتحاد کو سبوتاژ کرنے کے لئے کبھی مذہب کا سہارا لیا گیا تو کبھی صوبائی عصبیت کو ہوا دی گئی۔ لیکن طلبہ نے اپنی صفوں کو منظم رکھا۔ انہوں نے بیک وقت اندرونی دشمنوں اور سرکاری عتاب کا مردانہ وار مقابلہ کیا، اور طلباء کے شعور میں اضافہ کیا۔

۴ر دسمبر ۵۳ء سے یوم مطالبات کا آغاز ہوا۔ تمام کالجوں اور تعلیمی اداروں میں طلبہ کے اجتماعات منعقد ہوئے اور اس بات کا عہد کیا گیا کہ حصولِ مطالبات کی جدوجہد میں عملی اقدامات سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

لیکن حکومت کی جانب سے ایک بار پھر سرد مہری برتی گئی۔ دوسری طرف طلبہ متحد ہو چکے تھے۔ انھیں محنت کش عوام کی حمایت بھی حاصل تھی۔ وہ عوام تک اپنا موقف پہنچا چکے تھے، گو پریس کے ایک حصے نے جو ہمیشہ سرکار کی جی حضوری کرتا آیا تھا اپنا معاندانہ رویہ برقرار رکھا۔ اور اسے تحریک کے پس پشت بیرونی ہاتھ نظر آتے۔ لیکن قومی پریس نے طلبہ کا بھرپور ساتھ دیا۔ چونکہ طلبہ اپنے آپ کو منظم کر چکے تھے اور وزیرِ تعلیم سے ملنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں، لہٰذا ۵ر جنوری کو ڈی جے کالج میں طلبہ کے نمائندوں کا اجتماع منعقد ہوا جس میں ۷ر جنوری کو یوم مطالبات منانے کا اعلان کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ تمام طلبہ صبح نو بجے اپنے اپنے تعلیمی اداروں میں اجلاس منعقد کریں۔ اس کے بعد ڈی۔ جے کالج میں جمع ہوں۔ وہاں سے طلبہ کا جلوس قانون ساز اسمبلی جائے گا۔ جہاں طلبہ اپنے مطالبات وزیرِ تعلیم اور اراکینِ اسمبلی کے سامنے پیش کریں گے۔

۷ر جنوری کو طلبہ نے تعلیمی اداروں میں علامتی ہڑتال کی، احتجاجی اجتماعات منعقد کئے اور اس کے بعد جوق در جوق ڈی۔ جے کالج میں جمع ہونے لگے۔ یہاں پہلے جلسہ عام ہوا، اس کے بعد طلبہ جلوس کی شکل میں وزیرِ تعلیم کی کوٹھی کی جانب روانہ ہوئے۔ جلوس نے انتہائی نظم و ضبط اور پُرامن طریقے سے اپنا سفر جاری رکھا۔ گو راستے میں جگہ جگہ پولیس نے جلوس کو روکنے اور طلبہ کو اشتعال دلانے کی کوشش کی۔ پولیس افسران نے جلوس نکالنے کی ممانعت کر دی کہ اس سے وزیرِ تعلیم کی نیند میں خلل پیدا ہوگا۔ تین جگہوں پر زبردست لاٹھی چارج ہوا۔ طلبہ زخمی ہوئے لیکن انھوں نے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے دھوئیں میں اپنا سفر جاری رکھا۔ وہ وزیرِ تعلیم کی کوٹھی پر پہنچے ہی تھے کہ ایک لمبی کار جس پر جھنڈا لہرا رہا تھا، آ کر رکی۔ طلبہ سمجھے کہ شاید وزیرِ تعلیم ہوں، لیکن گاڑی سے موجودہ نائب صدر نور الامین برآمد ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ میں بنگال کا چیف منسٹر ہوں۔ میں آپ کے مطالبات کی حمایت کرتا ہوں اور وزیرِ تعلیم سے اس سلسلہ میں بات کروں گا۔ طلبہ نے کہا کہ آپ ہمیں وزیرِ تعلیم سے ملا دیں۔ نور الامین نے کہا کہ وہ جا کر وزیرِ تعلیم کو بھیجتے ہیں۔ نور الامین کوٹھی میں چلے گئے اور طلبہ وزیرِ تعلیم کا انتظار کرنے لگے۔ نور الامین کو اندر گئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ پولیس نے زبردست لاٹھی چارج اور آنسو گیس کی شیلنگ شروع کر دی۔ کافی طلبہ زخمی ہوئے۔ بعد میں طلبہ منتشر ہو گئے اور ان کے نمائندے رکے رہے کہ وہ ملاقات کر کے ہی جائیں گے۔ دو تین گھنٹے بعد وزیرِ تعلیم نے طلبہ کے نمائندوں سے ملنے کی زحمت گوارا کی، لیکن ان کے مطالبات انتہائی بے توجہی سے سنے اور کسی قسم کی یقین دہانی کرانے سے انکار کر دیا۔

۸ر جنوری کو تمام کراچی میں مکمل ہڑتال رہی۔ طلبہ نوکر شاہی کے ظلم و تشدد پر احتجاج کرنے کے لئے صبح سویرے ڈی جے کالج میں جمع ہونے لگے۔ آج ان میں ایک نیا ولولہ اور جوش تھا۔ لاٹھی چارج اور آنسو گیس کی شیلنگ بھی ان کا راستہ نہ روک سکی۔ انھوں نے دیکھا کہ انھیں عوام کا مکمل تعاون اور حمایت حاصل ہے۔ اور وہ بھی ان کی جدوجہد میں برابر کے شریک ہیں۔ ڈی۔ جے کالج سے جلوس برآمد ہوا۔ آج کا جلوس کل کے جلوس سے بھی بڑا تھا۔ ابھی یہ جلوس کیفے جارج تک بھی نہ پہنچا تھا کہ پولیس نے فسطائی انداز میں طلبہ پر لاٹھی چارج کر دیا۔ لیکن طلبہ نے اپنے آپ کو منظم رکھا اور سر بکف

میاں افتخار الدین نے طلبہ کی حمایت کا اعلان کیا

اسٹریٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ وہاں ایک کار آ کر رکی۔ اس میں میاں افتخار الدین اور کونسل مسلم لیگ کے موجودہ صدر سردار شوکت حیات اور ایک سابق وزیر سردار امیر اعظم، جو اس وقت حزبِ اختلاف کی آزاد پاکستان پارٹی میں شامل تھے، بیٹھے ہوئے تھے۔ میاں افتخار الدین کار کی چھت پر کھڑے ہو کر طلبہ کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اور کہا کہ آپ کے مطالبات جائز ہیں۔ میں ان کی بھرپور حمایت کرتا ہوں، اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دستور ساز اسمبلی، پبلک پلیٹ فارم اور پریس کے ذریعہ آپ کے مطالبات کی حمایت کروں گا۔

اس کے بعد جلوس الفنسٹن اسٹریٹ سے ہوتا ہوا کیفے جارج کی جانب چل پڑا۔ طلبہ کا مطالبہ تھا کہ وہ وزیرِ تعلیم سے ملیں گے۔ لیکن پولیس نے اندھادھند آنسو گیس کی شیلنگ شروع کر دی۔ موجودہ کے۔ ڈی۔ اے بلڈنگ کی جگہ اس وقت فردوس ہوٹل تھا۔ اس کے بیرے بالٹیاں بھر بھر کر طلبہ کے رومال بھگونے لگے۔ اتنے میں ایک لمبی سی چمکتی ہوئی نئی کار آ کر رکی۔ ایس۔ پی قمر رضا نے اعلان کیا کہ وزیرِ داخلہ مشتاق احمد گورمانی تشریف لے آتے ہیں۔ آپ اپنے رہنما بھیجیں تاکہ وہ ان سے گفتگو کر سکیں۔ یہ سنتے ہی طلبہ پُرامن ہو گئے گاڑی کا رخ طلبہ کی جانب تھا۔ مشتاق احمد گورمانی کار سے نکل کر طلبہ کی جانب بڑھے اور گفتگو کرنے لگے۔ اس نے کہا کہ میں آپ کے مطالبات کے سلسلے میں وزیرِ تعلیم سے بات کروں گا۔ آپ منتشر ہو جائیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ مطابات پورے کراؤں گا۔ اس گفتگو کے دوران بھی آنسو گیس کا ایک شیل آ کر گرا۔ اس پر طلبہ نے وزیرِ داخلہ سے شدید احتجاج کیا۔ گورمانی نے کہا کہ آپ لوگ بہت جذباتی ہیں۔ اور آپ کے لیڈر آپ کو بھڑکا رہے ہیں۔ طلبہ نے کہا کہ ہم آپ کو اپنا لیڈر بناتے ہیں۔ اور آپ کی قیادت میں وزیرِ تعلیم کے پاس چلتے ہیں اور اپنے مطالبات پیش کریں گے۔ لیکن گورمانی نے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ آپ کے مسئلہ کو ہم کیبنٹ کے اجلاس میں رکھیں گے، آپ اس کے بعد ہم سے ملیں۔ اس پر طلبہ نے "قاتلِ لیاقت گورمانی" اور "گو بیک گورمانی" کے نعرے لگائے۔ اسی دوران گاڑی کے پچھلے حصہ سے جہاں پیٹرول کی ٹنکی تھی اور جہاں صرف پولیس کے لوگ تھے اور ایک بھی طالب علم موجود نہیں تھا، شعلے بلند ہوئے۔ گاڑی میں آگ لگ چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس نے گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ گورمانی پولیس کے نرغہ میں ایک پولیس پک اپ میں بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ پولیس طلبہ پر اندھادھند گولیاں چلا رہی تھی۔ پہلا شہید ایک بارہ سالہ طالب علم غلام ربانی تھا۔

پاکستان ٹائمز اور امروز کے مطابق ۲۳۲ افراد مجروح ہوئے اور سترہ طلبہ شہید ہوئے۔ پاکستان ٹائمز نے اپنے نمائندہ جعفر نقوی کے حوالے سے خبر دی کہ عوام کی تعداد طلبہ سے زیادہ تھی۔ بعد میں لیگل ایڈ وائزری کمیٹی بنی — اس نے باون آدمیوں کے مارے جانے کی تصدیق کی۔ اسپتال میں ورثا سے کہا گیا کہ صرف وہ لاشیں ورثا کے حوالے کی جائیں گی جن کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ اسپتال سے بہت سی لاشیں گم کر دی گئیں۔

گورمانی کی کار جلنے کے واقعہ کے پسِ پشت بھی بہت سی کہانیاں ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کار میں دراصل ٹیئر گیس کا شیل لگنے کی وجہ سے آگ لگی۔ کیونکہ طلبہ کا وہاں تک پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسے تو پولیس گھیرے ہوئے تھی طلبہ تو اس سے بہت دور تھے۔

ظہیر رضوی اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں اور اس واقعہ میں ان کی ایک ٹانگ بھی ضائع ہو گئی۔ انھوں نے بتایا کہ جس وقت یہ واقعہ گزرا وہ سب سے آگے، گورمانی کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ گورمانی نے اپنی کار خود جلوائی تھی، اور اس کے دو مقاصد تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مشتاق احمد گورمانی نے دراصل یہ کار بحیثیت وزیر کے چودہ ہزار روپے میں خریدی تھی۔ کیونکہ وزیر ہونے کی حیثیت سے وہ ٹیکس سے مستثنیٰ قرار پاتے تھے۔ یہ کار اس وقت ٹیکس کی ادائیگی کے بعد مارکیٹ میں، ۷ ہزار روپے کی بنتی تھی اور بلیک میں اس سے بھی زیادہ کی ملا کرتی تھی۔ مشتاق احمد گورمانی نے اس کار کا ایک لاکھ روپے کا بیمہ کرایا ہوا تھا۔ اس طرح کار جلوا کر اس نے ایک لاکھ روپے کی انشورنس پالیسی حاصل کی اور ایک نئی کار لینے کا پرمٹ بھی۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس سے طلبہ پر گولی چلوانے کا جواز بھی حاصل ہو گیا۔

ظہیر رضوی نے ایک اور واقعہ بتایا کہ گولیاں لگنے کے بعد وہ گر پڑے۔ ان کی ٹانگ میں تین گولیاں لگی تھیں۔ اتنے میں پولیس والوں کی طرف سے سادہ لباس میں تین آدمی آئے انہوں نے انہیں اٹھایا۔ پولیس کی جانب سے ایمبولینس گاڑی آئی تاکہ جناح اسپتال لے جایا جا سکے انہوں نے اور بہت سے دوسرے طالب علموں نے پولیس کی ایمبولینس میں جناح اسپتال جانے سے انکار کر دیا۔ وہ آدمی ان کو اٹھا کر آگے بڑھے۔ ایک پرائیویٹ گاڑی گذر رہی تھی۔ اس کو ہاتھ دے کر رکوایا اور سول اسپتال پہنچا دیا۔ سول اسپتال میں جب ان کو ہوش آیا تو بہت شدید پیاس محسوس ہوئی۔ انہوں نے ڈاکٹروں سے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ پانی نہیں، آپ موسمبی کا رس منگا کر پی لیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے کپڑوں میں پیسے ہوں گے، اس سے منگوا لیں، معلوم ہوا کہ انہیں اسپتال پہنچانے والوں میں سے ایک نے جو خود کو ان کا بھائی ظاہر کرتا تھا، ان کے اٹھارہ روپے، گھڑی اور چشمہ اپنے قبضہ میں کر لیا تھا۔ تب انہیں احساس ہوا کہ وہ لوگ جو انہیں فرشتہ سیرت نظر آتے تھے۔ دراصل کفن چور تھے۔

پولیس فائرنگ سے جو لوگ شہید ہوئے ان میں (۱) حیدر علی بلوچ عمر ۲۱ سال (شادی شدہ) طالب علم سال اول سائنس (۲) غلام ربانی عمر ۱۲ سال، طالب علم (۳) رفیق دادا، عمر ۱۲ سال (۴) سنکھ لالی عمر ۱۵ سال (۵) ایک بنگالی طالب علم (۶) حفیظ اللہ، اسکول کا طالب علم (۷) دوہرا مزدور ولیکا ملز (۸) عبدالستار، سائیکل رکشہ ڈرائیور (۹) ایک پٹھان جو اپنے چچا سے ملنے کراچی آیا تھا (۱۰) نعمت اللہ، عمر ۲۳ سال ایک ڈرائی کلیننگ فیکٹری کا ملازم۔ یہ وہ شہید تھے جن کی نشاندہی دوسرے روز اخبارات نے کی بہت سے شہیدوں کا پتہ نہ چل سکا۔ ظہیر رضوی کے بیان کے مطابق اس دن ۵۲ افراد شہید ہوئے۔

طلبہ نے اپنا خون دے کر تحریک کو حرارت اور توانائی بخشی۔ ان کی جدوجہد میں جہاں ان کا خون گرا وہیں محنت کش عوام بھی ان کے برابر کے شریک تھے۔ شہیدوں میں مل مزدور، رکشہ ڈرائیور، ہوٹلوں کے ملازمین اور دوسرے محنت کش عوام بھی شریک تھے۔

لیکن شہریاروں کی رسی کے بل ابھی ڈھیلے نہیں ہوئے تھے۔ چیف کمشنر اے۔ ٹی نقوی نے بیان داغا جس میں طالب علموں کو شرپسند اور غنڈہ قرار دیا گیا۔ انہیں غیر ملکی سازشوں کا آلۂ کار قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ سب کچھ کمیونسٹوں کی شہہ پر ہو رہا ہے۔

۹ جنوری تک عوامی احتجاج کی لہر نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور حکومت کو بھی گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے کہا کہ ملک کا ایک ایک نوجوان اور بچہ میرا جگر گوشہ ہے۔

۹ جنوری کو وزیر اعظم ناظم الدین نے اپنی کوٹھی پر وزیرِ داخلہ گورمانی کے ساتھ طلبا نمائندوں سے ملاقات کی۔ مطالبات میں اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ وہ مطالبات تھے جو کہ ۷ اور ۸ جنوری کے ہنگامی حالات سے پیدا ہوتے تھے۔

وزیر اعظم نے طلبہ سے "بڑی ہمدردی" کا اظہار کیا۔ واقعات کی تحقیقات کے لئے ایک ٹربیونل قائم کیا گیا اور ان کے مطالبات کی تکمیل کے وعدے کئے گئے۔

لیکن ہوا وہی جو کہ پولیس اور انتظامیہ نے طے کر رکھا تھا وعدوں کی تکمیل کیا ہوتی ہے۔ بچوں اور بوڑھوں پر مقدموں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ تحقیقاتی کمیٹی نے پولیس فائرنگ کو حق بجانب قرار دیا۔ اور کہا کہ یہ کارنامہ پولیس نے اپنے فرائض کی بجا آوری کیلئے انجام دیا تھا۔

لیکن جنوری کی تحریک نے طلبہ تحریک کی تعین سمت کا اظہار

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

فضل محمود

کلرک

صفدر نے بوجھل قدموں سے دہلیز پھلانگتے ہوئے اپنی بغل میں دابی ہوئی فائلیں میز پہ پٹخ دیں اور چلایا "زینب ــــــ!" "جی بھائی ...." دُور سے زینب کی آواز سنائی دی۔ "ارے جلدی سے کھانا لے آ سخت بھوک لگ رہی ہے" چند لمحوں کے بعد زینب کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی، "تو ــــــ بھائی کھانا دفتر ہی منگوا لیا کرو نا ــــــ" "کون لے جائے گا؟" "چپڑاسی نہیں ہے تمہارے دفتر ــ" صفدر نے اپنی گردن پہ باندھے ہوئے ہاتھ کھلے چھوڑتے ہوئے کہا "ہے تو، پر وہ تو صاحب کے کاموں کے لئے ہوتا ہے، میں تو کلرک ہوں ــــــ"

یہ اکثر ہوتا کہ زینب اپنے بھائی کو یہ تجویز پیش کرتی کہ وہ کھانا دفتر ہی منگوا لیا کرے اور وہ بھی ہمیشہ ہی سے یہی جواب دیتا رہا کہ کون لے جائے گا اور اس مسئلے کے در آتے ہی دونوں ہتھیار ڈال دیتے اور زینب بھائی کے لئے کھانا لینے چل دیتی

کھانا کھاتے کھاتے کبھی کبھار جب صفدر کی نگاہیں بہن کے تیل لگے سنوارے بالوں پہ جمتی اور اس کی سیدھی مانگ دوپٹے کے سرکنے سے نظر پڑتی تو وہ ایک لمحے کے لئے مبہوت رہ جاتا اور چند لمحوں تک بے جان نگاہوں سے اُسے گھورتا ہی جاتا یہاں تک کہ پنکھا ہلاتے ہوئے زینب اس کی چوری نہ پکڑ لیتی "کیا گھورتا ہے بھائی ــــــ؟" صفدر ذرا گھبرا سا جاتا اور محتاط ہو کر کہتا "کچھ بھی تو نہیں" اور نظریں جھکا لیتا کیوں کہ یہ کہنے کی اُس میں جرأت نہ تھی کہ زینب میں تجھے گھورتا ہوں کہ مجھے تیری مانگ میں سیندور بھی بھرنا ہے۔

لیکن پچھلے مہینے سے جب ریاض ساتھ والے دفتر سے اس کے کمرے میں تبدیل ہو کے آیا تھا تو ایک اَن دیکھی قوت جیسے اس کے کندھوں پر رکھے ہوئے بھاری بوجھ کو ہلکا کرنے لگی تھی۔ اب وہ زینب کو گھورتا تھا اور زینب جب اُسے کہتی کہ کیا گھورتا ہے بھائی، تو وہ بڑی جرأت سے کہتا "تجھے ــــــ اپنی بہن کو" اور زینب اپنی بوجھل پلکیں جھکا کر اور تیز تیز پنکھا ہلانے لگتی۔

ایک شام جب وہ بھائی کی دھوبی سے آئی ہوئی قمیض کے ٹوٹے بٹن ٹانک رہی تھی تو باہر والے دروازے پر دستک ہوئی اس وقت صفدر بازار گیا ہوا تھا زینب نے تھوڑا سا دروازہ کھول کے استفسار کیا "کون ہے ــــــ!" سامنے ایک نکھرے سے خدوخال کا نوجوان کھڑا تھا "جی ــــــ ذرا صفدر کو بلا دیں" کچھ دیر تو وہ سوچتی رہی کہ کیا وہ ایک اجنبی کے سامنے اپنے گھر میں اکیلا ہونے کا اعلان کر دے پھر اچانک ہی اُسے کسی نے دلاسا دیا کہ وہ کون سا پرایا ہے صفدر کا دوست ہی ہوگا "بھائی تو بازار گیا ہوا ہے" کچھ دیر تک وہیں کھڑے کھڑے نوجوان کچھ سوچتا رہا شاید اُسے صفدر کے یوں گھر نہ ملنے کا ملال ہو رہا تھا پھر وہ بجھی مگر پُر فیصلہ آواز میں بولا "اچھا تو اسے کہہ دیجئے کہ ریاض آیا تھا!" ریاض کا نام سُن کر اُسے بھائی یاد آگیا، صفدر اکثر اُسے ریاض کے بارے میں بتایا کرتا تھا، ریاض کے بغیر ملے چلے جانے سے بھائی کو بھی افسوس ہوگا۔ اس نے کہا "آپ اندر آ کے بیٹھ جائیں بھائی آتا ہی ہوگا" معلوم ہوتا تھا اُسے بھائی سے بہت ضروری کام ہے تبھی اس نے زینب کی دعوت قبول کر لی تھی البتہ ایک بار اس نے بھی محض دکھاوے کیلئے اور رسماً کہا تھا "کوئی بات نہیں میں اُسے دفتر میں مل لوں گا" "آپ بیٹھیں بھائی آتا ہی ہوگا"

اس دن کے بعد ریاض اکثر ان کے ہاں آنے لگا اب وہ ریاض کے سامنے بے تکلفی سے آ جا سکتی تھی لیکن باتیں کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی سوائے اس کے کہ صفدر نے کہا "زینب چائے نہیں پلاؤ گی ہمیں ــــــ" "ابھی لاتی ہوں بھائی، میں نے کب انکار کیا ہے" وہ دوپٹے کو سنبھالتے ہوئے کہتی تو ریاض ایک پرجوش سی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے کہتا "کیوں انہیں تکلیف دیتے ہو صفدر ــــــ اس کا مطلب ہے کہ میں تمہارے گھر نہ آیا کروں" زینب اس فقرے سے جہاں ایک ان جانی مسرت میں ڈوب جاتی وہاں یہ خواہش بھی اس کے دل میں بیدار ہوتی کہ ریاض اپنی منشا کو پایۂ تکمیل نہ پہنچا پائے کیونکہ اس تکلیف ہی کی بدولت تو وہ ایک عظیم تر روحانی لذت سے آشنا ہوئی ہے۔ اور اس دن تو اس عظیم لذت و شادمانی نے اسے اپنے وجود میں پوری طرح جذب کر لیا۔ جب ریاض نے بھائی کی عدم موجودگی میں اس سے کہا "زینب" اس کا لہجہ بہت جذباتی تھا جیسے دکھوں کی انتہا کے اظہار سے آواز بھرا جاتی ہے۔ "جی ــــــ چائے لاؤں" "نہیں!" ریاض نے دھیرے سے کہا "تمہیں کسی روز مہمان نوازی سے بھی تو فرصت ملے۔" وہ بدستور خاموش رہی "میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم جیسی میری بھی ایک بہن ہے تمہاری طرح سادہ اور پر خلوص، وہ سر کو انگلی سے کھجاتے ہوئے زینب سے یہ سوال کئے بغیر نہ رہ سکا "تو کیا ساری بہنیں تمہاری ہی طرح ہوتی ہیں" "جی ــــــ" اس نے اس مختصر تائید ہی کو مناسب جانا۔ کچھ لمحوں تک ریاض نے بھی خاموشی اختیار کئے رکھی اور پھر دھیرے دھیرے بولا "اُسے بھابھی کا بڑا شوق ہے وہ تم جیسی ہی بھابھی ڈھونڈتی پھرتی ہے"

ریاض ایک باکردار انسان تھا اس لئے اس کے اگلے روز صفدر سے براہ راست گفتگو میں اپنا مدعا بیان کیا اور صفدر کو یوں محسوس ہوا کہ جیون میں آج پہلی بار اُسے فتح نصیب ہوئی اور فتح بھی ایسی جو غیر معمولی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ریاض کے فوری طور پر شادی کے مطالبے نے اُسے سوچوں میں ڈال دیا۔ آج اُسے پہلی بار یہ سخت احساس ہوا کہ بہن کو وداع کرنا ہوگا وہ بہن جو اس کے ہر دکھ اور سکھ کی ساتھی ہے اور وداع کرنے کیلئے جہیز دینا ہوگا اور عزت سے الوداع کرنے کے لئے ایک اچھا جہیز چاہیئے اور اچھے جہیز کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ بینک میں اس کے نام آٹھ سو روپے جمع تو تھے لیکن آٹھ سو روپوں سے تو بمشکل جھمکوں کی ایک جوڑی ہی بنے گی اور جہیز میں دینے کو تو بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔ ان چیزوں کی فراہمی کے لئے کم سے کم سال بھر کی مہلت تو ضروری تھی۔

اب وہ دفتر سے لوٹنے پر زینب کو زور سے پکارتا نہیں تھا بلکہ وہ حسب معمول خود ہی اس کے سامنے ہی کھانا لا رکھتی تھی کیونکہ جلدی کا جو بوجھ ریاض نے اس کے کندھوں پر ڈال دیا تھا۔ وہ اس کے ناتواں شانوں پر بہت بھاری تھا۔ ایک سو چالیس روپے کے کلرک اس دور میں تو صرف زندگی کی گاڑی کو دھکا ہی دے سکتے ہیں، جہیز کے ان گنت تقاضے ایک ہی لمحہ میں کیسے پورے ہو سکتے ہیں۔ بہر حال پھر بھی وہ مطمئن تھا کہ وہ ریاض کے کردار اور شخصیت کے پہلوؤں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایک بہت بڑے جہیز کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ پھر بھی اگر ایک بڑا جہیز نہ بھی دیا جائے تو کچھ نہ کچھ تو دینا ہی ہوگا۔ اور کچھ نہ کچھ دینے کے لئے بھی تو بہت سے روپوں کی ضرورت ہے۔ وہ ہمیشہ کی ریاض کی ماں کی یاد دہانی پر صاف صاف کہہ دیتا "ماں جی آپ تو جانتی ہیں کہ گھر میری تنخواہ پر چل رہا ہے آخر شادی کرنا ہے تو کچھ روپوں کا بندوبست

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

اظہارِ خیال

قومیتوں کا مسئلہ انتہائی اہم ہے۔ اس پر جناب پیکر نقوی نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ آپ بھی اس بحث میں حصّہ لے سکتے ہیں ۔ (ادارہ)

قومیتوں کی تحریک کو وڈیرہ شاہی کے رتھ سے باندھ دیا گیا

پیکر نقوی

قومیتوں کے مسئلہ پر ترقی پسندوں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے اور وڈیرہ شاہی کے پروردہ "شاہزادوں" نے بھی۔ بنیادی طور پر ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ عمل و تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ان کی تحریروں اور تقریروں کا صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ عوام کو کنفیوز کر کے مرتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کو جس قدر طویل زندگی ممکن ہوسکے، عطا کی جائے۔

میں چونکہ سندھ میں قومیت کی تحریک سے شروع ہی سے وابستہ تھا، اس لئے میں نے ذاتی طور پر دیکھا کہ ترقی پسندوں اور وڈیرہ شاہی کے کارپردازوں نے ایک ہی کام کیا۔ دونوں کی ایک کوشش رہی ہے یعنی قومیتوں کی تحریک کو دم توڑتی ہوئی وڈیرہ شاہی کے رتھ سے باندھ کر اس طرح گھسیٹا جائے تاکہ عوام راہ سے بھٹک جائیں اور ان کے سامنے سے وہ اصل منزل اوجھل ہو جائے جس کے لئے وہ جدوجہد کر رہے ہیں۔ سندھ میں جی ایم سید دونوں ہی گروہوں کے متفقہ رہنما تھے۔ ترقی پسندوں نے اپنی شان امتیاز صرف اس طرح برقرار رکھی کہ انہوں نے جی ایم سید تحریک سے وابستہ مختلف قومیتوں کے دوسرے وڈیروں کو محب وطن زمینداروں کا لقب عطا کیا۔ قومیتوں کے حقوق کے لئے جدوجہد کی صرف دو راہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک راہ جو فسطائیت کی جانب لے جاتی ہے۔ یقینی طور پر اس کی قیادت جاگیرداروں، زمینداروں اور سامراج کی پروردہ نوکر شاہی کے ایجنٹوں کو کرنی چاہیئے تھی۔ جو انہوں نے کی۔ جب کہ اسکی دوسری راہ سائنٹیفک ہے، جس کی قیادت بلاشبہ مزدور طبقہ کو ہی کرنی چاہیئے تھی اور اس تحریک کا جزو لازم ہاریوں، شہر اور دیہات کے متوسط طبقہ کے لوگوں کو ہونا چاہیئے تھا۔

پاکستان میں مسئلہ قومیت کے متعلق میری رائے واضح رہی ہے اور میں شروع ہی سے اس خیال کا حامی رہا ہوں کہ قومیتوں کی تحریک دراصل ملک کی آزادی و سلامتی کی تحریک ہے اور اسے قومی جدوجہد آزادی اور سوشلزم کی جدوجہد سے جدا نہیں کر کے دیکھا جا سکتا۔

پاکستان میں اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے ہمیں قیام پاکستان کے بعد سے اب تک صورت حال کا سرسری جائزہ لینا ہوگا۔ اور یہ سمجھنا ہوگا کہ انگریزوں نے تقسیم سے عیاری کا کام لے کر پاکستان کو ایک ایسا ملک بنا کر چھوڑ دیا کہ اُسے کبھی استحکام حاصل نہ ہونے پائے اور جب بھی ضرورت پیش آئے اسے توڑ دیا جا سکے۔ ان کی سب سے بڑی عیاری یہ تھی کہ ملک کے دونوں بازوؤں کی دو سب سے بڑی قومیتوں۔ یعنی بنگالیوں اور پنجابیوں کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس لئے، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے پاکستان کے استحکام و سالمیت کی اس وقت تک ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی جب تک کہ قیام پاکستان کے بعد ہماری جدوجہد کا اصل مقصد دونوں بڑی قومیتوں کو یکجا کرنا نہ ہوتا۔ اس مقصد کے لئے ہمیں جو دستور یا لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیئے تھا اسکی بنیاد سیکولر ہونی چاہیئے تھی تاکہ یونائیٹڈ اسٹیٹس آف پاکستان کی تکمیل کی راہ ہموار ہو سکے۔ سیاسی اور اقتصادی آزادی حاصل ہو سکے۔ لیکن بدنصیبی سے ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ انگریزوں نے ہمیں آزادی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے سروں پر اپنے وفادار جاگیرداروں کی ٹولی اور ریاستی مشنری کی شکل میں اپنی تلوار لٹکا رکھی تھی۔

چنانچہ تحریک پاکستان کے دو مقبولِ عام رہنماؤں یعنی قائداعظم اور لیاقت علی خاں کو راہ سے ہٹانے کے بعد سامراج کے وفاداروں نے جو کچھ کیا وہ ہمارے سامنے ہے۔ نوکر شاہی نے غلام محمد اور چوہدری محمد علی کی شکل میں پہلے ملک پر قبضہ کیا اور جاگیرداروں، زمینداروں کی ٹولی کی مدد سے حکومت چلانے کی کوشش کی۔ اس سے کام نہ چلا تو پھر ایوب خان کی شکل میں فوج سے مدد طلب کی گئی۔ اور یحییٰ خان تک جو کچھ ہوا وہ ہمارے اس نظریہ کی تصدیق کرنے کو کافی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ کیا قومیتوں کی تحریک کو وطن دشمن اور غداری کا سرٹیفیکیٹ عطا کر کے اور سیکولر اسٹیٹ کو لادینی نظام کا نام دے کر ہمیں پھر اسی سارس کی طرح ریت میں منہ چھپا کر بیٹھ جانا چاہیئے۔ جس کے سر پر موت منڈلا رہی ہے۔ یا ہمیں حقیقت پسندانہ نکتہ نظر اختیار کرنا چاہیئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ مسئلہ قومیت کو لینن کی فکر کے مطابق حل کریں۔ کیونکہ اس راہ میں قدم قدم پر آپ کی مصلحتیں حائل ہوں گی۔

لینن نے قومیتوں کا جو تصور پیش کیا وہ ہمیشہ کے لئے خصوصاً پاکستان جیسے ملک کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس نقطۂ نگاہ کو اپنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم آج پاکستان کو چار قومیتوں یعنی سندھی۔ پنجابی۔ بلوچ اور پٹھان کا ملک تسلیم کریں اور انہیں پاکستان کی بنیاد تصور کریں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی تسلیم کریں کہ پنجابی قومیت اسوقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک بھارت میں شامل حصہ اپنی قومیت سے وابستہ نہ ہو جائے۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ افغانستان خود کوئی ملک نہیں ہے۔ وہ دو قومیتوں یعنی پشتو بولنے والے پختون اور فارسی بولنے والے ایرانیوں پر مشتمل ہے۔

اسی طرح لینن کے مسئلہ قومیت کے اصولوں کی روشنی میں بلوچی بولنے والے ایرانی باشندے بلوچستان کا حصہ ہیں۔ اور سندھی بولنے والے گجراتی اور راجستھان بھی سندھ کا حصہ ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ آپ لینن کا نظریہ اپنائیں کیونکہ اس کی راہ میں آپ کی دوستیاں اور مصلحتیں حائل ہوں گی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں قومیتوں کے مسئلہ کا حل دریافت کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ اس پر ہمارے ملک کی بقاء اور مستقبل کا انحصار ہے۔ اگر آج ہم وقتی طور پر لیپا پوتی کر کے قومیتوں کے مسئلہ کو ٹال دیں، تو یہ مسئلہ کا کوئی حل نہیں وہ پھر کسی بھی وقت سر اٹھائے گا اور حکمران طبقہ اپنے شیش محلوں کی حفاظت کے لئے اپنے ہی ملک کے عوام کو مختلف نعروں کے تحت لڑا کر اور ان کے گھروں کو نذرِ آتش کرا کے ہاتھ تاپیں گے۔ یہ صورتحال ملک کے لئے کس حد تک مفید ہوگی۔ اس کا ہمیں آج ہی اندازہ لگانا اور کوئی نہ کوئی حل دریافت کرنا ہوگا۔

اس لحاظ سے پاکستان میں قومیتوں کے حقوق کی جدوجہد نہ صرف اس ملک کی بقاء کی جدوجہد ہے۔ بلکہ یہ جدوجہد قومی جدوجہدِ آزادی، امن اور سوشلزم کی جدوجہد بھی ہے۔ اس کی رہنمائی صرف اور صرف مزدور طبقہ ہی کر سکتا ہے۔ اور اس جدوجہد کے جزو لازم کھیت مزدور چھوٹے اور غریب زمیندار کسان دستکار اور شہر کے غریب اور متوسط طبقہ کے عوام ہیں اس جدوجہد کی پہلی منزل جو بوئے سوکاٹے اور سامراج کی اقتصادی اور بالواسطہ سیاسی غلامی کا جوا اتار پھینکنا ہے۔ دراصل اس منزل کے حصول کے نتیجہ میں سوشلزم کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ ورنہ تمام نعرے فریب اور یوٹوپیائی بن کر رہ جائیں گے۔

محکمہ تعلیم کے
ایک افسر نے
ضابطہ کو
"ظابطہ" لکھا

حیدرآباد

اساتذہ ـ مصائب کی کڑی دھوپ میں

راز طالبانی

موجودہ حکومت نے اپنے ایک سالہ دور میں کئی اصلاحات کیں لیکن وہ ابھی تک صرف کاغذی کارروائی تک محدود ہیں۔ زرعی اصلاحات سے ہاریوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا لیبر پالیسی سے محنت کش مطمئن نہیں، قومی صحت کی اسکیم میں ۳۰۸ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں لیکن ابھی تک اس پر عملدرآمد نہیں ہوا ہسپتال دواؤں سے خالی ہیں۔ سرکاری ڈاکٹر اپنے پرائیویٹ کلینک کے ذریعے دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹ رہے ہیں۔ اگرچہ تیسرے، چوتھے درجے کے ملازمین کی تنخواہوں میں معمولی سا اضافہ بھی کیا گیا ہے مگر مہنگائی اتنی بڑھ چکی ہے کہ اضافہ کی افادیت بالکل ختم ہو چکی ہے۔ جب ملازمین اپنے جائز مطالبات حکومت کے سامنے رکھتے ہیں یا ان کو تسلیم کرانے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں تو حکومت اس جدوجہد کو ناجائز اور غیر قانونی قرار دیتی ہے۔ موجودہ وزراء اپنے لئے تو قیمتی فرنیچر سے آراستہ ائرکنڈیشنڈ بنگلے، آمدورفت کے لئے ہیلی کاپٹر، جہاز اور امپالا جیسی لمبی لمبی کاریں طلب کرتے ہیں لیکن محنت کش مزدوروں (جس میں سرکاری، نیم سرکاری، تیسرے اور چوتھے درجے کے ملازمین بھی شامل ہیں) سے زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا گیا ہے۔

پرائمری اساتذہ جو انسانیت کو معراج تک پہنچاتے ہیں۔ اور جن کی فلاح و بہبود کے بغیر ملک اور قوم کی ترقی ناممکن ہے، مسائل اور مشکلات کے انبار تلے دبے ہوئے ہیں۔ ایک مزدور کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپیہ ہے لیکن پرائمری کے استاد کی بنیادی تنخواہ ایک سو پچیس روپے ہے، موجودہ حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ تعلیمی پالیسی سے لاکھوں طلبہ کو سہولت حاصل ہوگی۔ اساتذہ کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں ختم ہو جائیں گی سینیارٹی اور صلاحیت کی بنیاد پر تقرریاں اور ترقیاں دی جائیں گی کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی۔ لیکن افسوس کہ یہ سارے خوش آئند وعدے فراموش کر دیئے گئے اور اساتذہ کے ساتھ ناانصافیاں بڑھتی گئیں۔

یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ آج کل کی تعلیم ناقص ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں، لیکن اس کے بنیادی اسباب کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ ہر تقرری بغیر سینیارٹی اور صلاحیت کے ہوتی ہے، جو ایجوکیشنل سپروائزر لئے جاتے ہیں ان کی صلاحیت سوائے شرٹ، پینٹ اور میک اپ کے اور کچھ نہیں ہوتی، وہ کورس کی کتابوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ گھر بیٹھے امتحانات کا نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ ایسے ایک افسر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب وہ ایک اسکول کے معائنہ کے لئے گئے تو انہوں نے نوٹ میں کئی لفظ غلط لکھے ــــ "ضابطہ" کے بجائے "ظابطہ" اور "دینیات" کے بجائے "دیناد" لکھا۔ جب یہ حالت ہو تو کیا ہماری تعلیم ناقص نہ ہوگی۔ اگر ان آسامیوں پر پرائمری اساتذہ کو ترقیاں دی جائیں تو معیارِ تعلیم میں اضافہ ہوگا۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اگر کوئی آج پرائمری استاد ہے تو مرتے وقت بھی استاد کی آسامی پر ہی رہے گا۔ آخر پرائمری اساتذہ کو ترقی کے مواقع فراہم کیوں نہیں کئے جاتے؟ جبکہ بعض بی۔اے، بی ایڈ ایم۔اے، ایم۔ایڈ جیسی ڈگریاں بھی رکھتے ہیں۔

جب بھی کوئی مشکل وقت آتا ہے تو اساتذہ سے پہلے مدد لی جاتی ہے اور وہ نہایت فراخدلی سے ہر مشکل میں پیش پیش رہتے ہیں لیکن انھیں کوئی معقول معاوضہ نہیں دیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے جنرل الیکشن اور ۱۹۷۲ء کے مردم شماری کا معاوضہ ابھی تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ حالانکہ دوسرے محکموں کے ملازموں کو یہ معاوضہ ادا کیا جا چکا ہے۔ یہاں تک کہ محکمہ تعلیم کے وہ افسران جنھوں نے جنرل الیکشن یا مردم شماری کی ڈیوٹی انجام دی تھی ان کو بھی معاوضہ دیدیا گیا ہے۔ لیکن پرائمری کے اساتذہ کو ابھی تک محروم رکھا گیا ہے۔

۱۹۷۰ء میں پرائمری اساتذہ کے لئے تنخواہوں کا سکیل مقرر کیا گیا جس سے اساتذہ کی امیدیں صحیح طرح پوری نہیں ہوئیں۔ وہ حکومت کے سامنے گڑگڑائے۔ روئے پیٹے اور اپنے مطالبات پیش کئے۔ پھر بھی حکومت کو رحم نہیں آیا اور یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ "ہم اس پر نظرثانی کر رہے ہیں" مگر آج تک اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ اساتذہ تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ اس لئے نہیں کرتے کہ وہ بھی عیاشی کر سکیں۔ پیدل چلنے کے بجائے کاروں یا ہوائی جہازوں پر سفر کر سکیں۔ جھگی میں رہنے کے بجائے بنگلوں میں رہ سکیں۔ وہ تو صرف اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لئے تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

کوئی بھی ماہرِ معاشیات ۱۲۵ روپے ماہانہ آمدنی سے گھر کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا جبکہ اس گرانی کے دور میں دیہاتوں میں ڈالڈا ۶½ روپے فی سیر ہے۔ آٹا ۳۰ روپے من اور دودھ ایک روپیہ پچیس پیسے فی سیر ہے۔ چینی ۶ روپے سیر، مرچ آٹھ روپے، گوشت ۶ روپے سیر ہے۔ درمیانہ درجے کا چاول سوا روپیہ فی سیر ہے۔

ایک اسکول کے نائب محمد سلطان کو ۲۵ سال کی ملازمت ہونے کے باوجود ایک سو بیس روپے تنخواہ ملتی ہے۔ اسے آٹھ افراد کی نگہداشت کرنی ہوتی ہے۔ اگر بچوں کے لیے جوتے لاتا ہے تو کپڑے نہیں بنتے، کپڑے بنواتا ہے تو جوتے نہیں بنتے پھر خدانخواستہ اگر کوئی فرد بیمار ہو جائے تو اس کے علاج معالجہ کے لئے ایک پائی بھی خرچ کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔

افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ استاد کو قوم کا معمار تو کہا جاتا ہے لیکن ان کی جان و مال کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی۔ جب بھی کسی زمیندار کو غصہ آتا ہے تو اساتذہ کو ایسی زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے جس کو وہ بچوں کو پڑھاتے وقت استعمال کرتے ہیں۔ کل ہی کا واقعہ ہے کہ ستمبر ۱۹۷۲ء میں سیوہن تحصیل سے ایک پرائمری استاد محمد باقر کو ۱۱۰ ایکٹ کے تحت مردم شماری کے کام کے دوران گرفتار کیا گیا، جو ابھی تک جیل میں زندگی گزار رہا ہے۔ جب اس کے خلاف وہاں کے پرائمری اساتذہ کی ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر اللہ بخش نے احتجاج کیا تو فوراً اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ باندھی سے ماسٹر محمد بخش کو غنڈہ ایکٹ کے تحت

گرفتار کیا گیا اور بعد میں "باعزت طور پر" بری کر دیا گیا۔ ۱۱ نومبر ۷۲ء کو اسکول کے اوقاتِ کار کے دوران ماسٹر محمد پریل کو ٹھٹھو تحصیل کوٹری سے میرپور بٹھورو کی پولیس نے گرفتار کیا جس کو تین چار روز بعد مجبوراً آزاد کر دیا گیا، کیوں کہ ماسٹر نے رشوت دینے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء کی جنگ کے دوران تھرپارکر ضلع سے پانچ سو ہندو پرائمری اساتذہ کو سانگھڑ، ٹھٹھہ، دادو، حیدرآباد کے اضلاع میں تبادلہ کر دیا گیا۔ اس طرح سکھر ضلع سے کچھ ہندو اساتذہ کو شکارپور ڈویژن میں بھیجا گیا۔ اس وقت ایسے تمام محکموں کے ملازمین کو واپس اپنے اپنے علاقے میں بھیجا گیا ہے، لیکن ابھی تک صرف پرائمری اساتذہ سے ایسا ظلم کیوں برتا جا رہا ہے۔ شاید اسی لحاظ سے اساتذہ کی اکثریت کسی زمیندار کے بچوں کے اساتذہ کی نہیں ہے۔ وہ کسی جاگیردار کے بچوں کے اساتذہ نہیں ہیں، کسی سرمایہ دار کے بچوں کے اساتذہ نہیں ہیں، بلکہ وہ صرف کسانوں کے بیٹوں کے اساتذہ ہیں۔ مفلس مزدوروں کے بچوں کے اساتذہ ہیں۔

موجودہ حکومت نے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے تو اساتذہ سے کئی وعدے کئے لیکن اب اس کے وعدے نہ معلوم کہاں غائب ہو گئے۔ ایوب حکومت نے علاقائی زبانوں کو کچلنے کے لئے ورنیکولر امتحانات کو ختم کر کے، سندھ کے اکثریتی طبقے مزدور کسان کے بچوں کی راہ میں رکاوٹ ڈال دی۔ جس سے سندھ کی کئی طالبات بھی محروم ہو گئیں جو دیہاتوں میں انگریزی سکول نہ ہونے کی وجہ سے اپنی تعلیم کو صرف پانچویں جماعت تک محدود رکھنے پر مجبور ہیں۔

مذکورہ بالا مسائل کو حل کرانے کے لئے آل سندھ پرائمری ٹیچرس ایسوسی ایشن نے کئی بار حکام سے گفتگو کی ہے، مذاکرات کئے ہیں اور عوامی وزراء سے ملے ہیں۔ لیکن جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو ۱۲ نومبر ۷۲ء کو اپنی ایک ہنگامی میٹنگ میں حکومت سندھ کو اٹھارہ مطالبات پر مشتمل ایک یادداشت پیش کی۔ انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ فوری طور پر اساتذہ کے مسائل پر غور کیا جائے۔ دوسری صورت میں سندھ کے ..... ۷۳ ہزار اساتذہ ۲۲ جنوری ۱۹۷۳ء کو مکمل ہڑتال پر جانے کو مجبور ہو جائیں گے۔ اساتذہ نے اپنی پرامن ہڑتال اور جدوجہد کو آخری شکل دینے کے لئے ۲۶ نومبر ۷۲ء کو خیرپور میرس میں ایک اجلاس بلایا۔ سندھ کے صوبائی وزیر دُرمحمد اوستو نے مسٹر جان محمد جمالی صدر آل سندھ پرائمری ٹیچرس ایسوسی ایشن ارکان کو فوری طور پر طلب کیا اور کہا کہ "حکومت اساتذہ کے مسائل پر غور کر رہی ہے لہٰذا ہڑتال کا نوٹس واپس لیا جائے۔"

ایسوسی ایشن کے صدر نے جواب دیا کہ "جنابِ والا! اساتذہ آپ کے ایسے وعدوں سے کافی تنگ اور مایوس ہو چکے ہیں، یہ مسائل سالوں سے صرف فائلوں کی گردش تک محدود ہیں۔ ان کے حل کے لئے آج تک کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔" اوستو صاحب نے کہا کہ "مجھے اجلاس سے خطاب کرنے کے لئے مدعو کیا جائے، تاکہ میں اساتذہ کو اور یقین دلا دوں۔" جمالی صاحب نے کہا کہ "چونکہ آپ کو مدعو کرنے کے لئے جنرل باڈی ہی مجاز ہے، لہٰذا آپ کا اجلاس کو خطاب کرنا ناممکن ہے۔" وزیر موصوف کا غصہ ابل آیا اور فرمایا کہ "اگر مجھے اس اجلاس سے خطاب کرنے کے لئے مدعو نہیں کیا جاتا تو میں فوراً ٹیچرس ایسوسی ایشن کو غیر قانونی قرار دے کر بندش ڈال دوں گا۔"

بات تو اور بڑھ جاتی لیکن یہاں پر بھی اساتذہ نے صبر سے کام لیا اور انہیں اپنے اجلاس میں خطاب کرنے کو مدعو کیا۔ ۲۶ نومبر ۱۹۷۲ء کو جب پورے سندھ سے اساتذہ خیرپور میرس میں اکٹھے ہوئے۔ انھیں معلوم ہوا کہ اس اجلاس سے وزیرِ تعلیم خطاب کرنے والے ہیں، اساتذہ نے مخالفت کی اور کہا کہ یہ اجلاس اساتذہ کے لئے ہے، لہٰذا صوبائی وزیر کا اجلاس سے خطاب کرنا سراسر غلط اقدام ہے۔ اگر انہیں اساتذہ کے مسائل کا احساس ہے تو الگ اجلاس بلا سکتے ہیں۔ کافی بحث و مباحثہ کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ وزیر کو صرف خطاب کرنے کے لئے اجازت دی جائے، لیکن وہ اس اجلاس کی صدارت نہیں کر سکتا۔ بہرحال وزیرِ موصوف نے خطاب کیا اور حسبِ معمول ان پرانی باتوں کو دہرایا۔ اساتذہ کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے پھر وعدہ کیا کہ حکومت مستقبل قریب میں ان پرائمری اساتذہ کو اعلیٰ جگہوں پر تعینات کرے گی، جو ضروری تعلیمی اہلیت رکھتے ہیں۔ ایجوکیشن سپروائزر کے تقرری میں وقت پرائمری اساتذہ کا خاص کوٹا مقرر کیا جائے گا۔ محکمہ تعلیم میں ہر خالی آسامی پرائمری اساتذہ کے بچوں سے پُر کی جائے گی۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ان وعدوں کی تکمیل کب تک ہوتی ہے یا یہ وعدے صرف تقریروں تک محدود رہیں گے۔ اس وقت اساتذہ ایسے وعدوں سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ یہ مسائل جدوجہد کے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ صرف وعدوں پر یقین رکھنا غلط ہے۔ مقصد کی کامیابی تک جدوجہد جاری رہے گی، چاہے اس میں کتنی ہی بڑی قربانیاں دینی پڑیں۔ کیونکہ جہاں جدوجہد ہوتی ہے وہاں قربانیاں لازمی ہوتی ہیں۔

یہ ہے پرائمری اساتذہ کا عزم۔ یہ مسائل اساتذہ کے نئے مسائل نہیں ہیں۔ یہ وہی مسائل ہیں جو ایوب حکومت میں تھے، یہ وہی مسائل ہیں جو یحییٰ حکومت میں تھے۔

لہٰذا اس عوامی حکومت سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ پرائمری اساتذہ کے مسائل پر جلد غور کرے گی اور ان کے حل کے لئے مناسب اقدام اٹھائے گی۔

نئے دور کے نئے آقا، نئے دور کے پرانے غلام

محمد یوسف

جب نیم نوآبادیاتی، نیم جاگیردارانہ سماج کا کوئی فرد کتابِ زندگی کا ورق پلٹتا ہے تو اسے پنجاب کی سرزمین پر شہروں کے ساتھ ملحقہ کھیتوں میں ایک اونچی سی چمنی کے سائے تلے نئے دور کے نئے آقا اور نئے دور میں پرانے غلام نظر آئیں گے۔ یہ ہیں "بھٹہ مالک اور بھٹہ مزدور" —— بھٹہ مالک کیسے وجود میں آتے ہیں؟ اپنی محنت سے؟ نہیں! ہرگز نہیں! بلکہ یہ پیداوار ہیں۔ جھوٹ، بدمعاشی، عیاری، زور زبردستی اور دھوکہ بازی کی، جبکہ بھٹہ مزدور وہ لوگ ہیں جنھیں بھوک، افلاس، بیروزگاری، تنگ دستی اور فاقہ کشی کی لاٹھی جانوروں کے ریوڑ کی طرح ہانکا کر کے بھٹہ میں لا جھونکتی ہے۔ یعنی بھٹہ مزدوری کا پیشہ دیہات میں وہ شخص اختیار کرتا ہے جسے ہر جگہ سے دھتکار دیا گیا ہو، اور دیہات میں اسے کوئی اور روزگار نہ ملتا ہو۔ کیونکہ بھٹہ مزدوروں کی حالت اتنی قابلِ رحم ہوتی ہے کہ اگر وہ ہزار آدمیوں میں بھی کھڑا ہو تو اپنی تباہ حالی اور مدقوق چہرے سے پہچانا جا سکتا ہے۔ بھوک کے خوف سے وہ عموماً کسان کی آنکھ کھلنے سے بھی قبل گھبرا کر اٹھ جاتا ہے اور اینٹوں کے لئے گھانی تیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے اوقاتِ کار گھڑی کی سوئیوں کے پابند نہیں بلکہ وہ آج بھی اندھیرے اور روشنی سے اپنے وقت کا تعین کرتا ہے۔ اندھیرے میں کام شروع کرو اور جب تک سورج تمہارے سروں پر چمکتا ہے، پوری قوت و توانائی سے کام کرتے رہو۔ اور جب پھر اندھیرا پھیل جائے تو اپنی سیاہ بختیوں کو سمیٹ کر سو جاؤ کہ تمہیں پھر اندھیرے میں اٹھنا ہے۔

بھٹہ کا ایک مزدور اوسطاً ۱۶ گھنٹے کام کرتا ہے۔ جس

کی قیمت محنت کے بازار میں صرف دو روپیہ ہے کیونکہ اسے اجرت فی ہزار اینٹ چھ روپے کے حساب سے ملتی ہے جبکہ ایک مزدور دن بھر میں چار سو اینٹیں تیار کرتا ہے۔ اور اس عمل میں اس کے تین سالہ بچے سے لے کر بوڑھے باپ تک شامل ہوتا ہے۔ گویا یہ ہمارے ملک میں سب سے زیادہ محنت کرنے والی مخلوق ہے جسے سب سے کم مزدوری ملتی ہے۔ اور پھر یہ کہ کارخانوں میں مزدوروں کو جو سہولتیں میسر ہیں، یعنی روزگار کی وقتی ضمانت، بونس، فنڈ، سوشل سکیورٹی چھٹی وغیرہ ان میں سے بھٹہ مزدوروں کو کوئی بھی سہولت نہیں ملتی۔ اب دیکھئے! صدر بھٹو کا فیکٹری ایکٹ جو بہت خوبصورتی سے کاغذ پر ٹائپ کر کے بڑے سلیقے سے فائلوں میں سجا کر رکھا گیا ہے۔ اور جس کی تعریف میں درباری اخبار نویس صفحے کے صفحے سیاہ کر رہے ہیں۔ اور سرکاری اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی والوں نے قصیدہ گوئی کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا ہے۔ اس کی دھجیاں بھٹوں پر اڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پروفیسر ایرک سپرین نے سچ کہا ہے کہ حکمران طبقے آج کل ابہام کی سیاست کر رہے ہیں۔ جو کچھ کہتے اور شور مچاتے ہیں، عمل اس سے قطعی مختلف ہوتا ہے اس کی منہ بولتی تصویر "پنجاب کے بھٹے اور لیبر فیکٹری ایکٹ" میں دکھائی دیتی ہے۔ جہاں بھوکوں مرتا مزدور اصلاحات اعلانات سے بے نیاز ظلم و ستم کے بے پناہ تھپیڑے کھا رہا ہے —— قدیم ترین غلامی کا بدترین نمونہ —— اس کے گرد نظر نہ آنے والا جال بچھا ہوا ہے جس میں ایک مرتبہ جو مزدور پھنس جائے، اسے موت ہی اس قید سے نجات دلاتی ہے۔ وہ کیسے؟ اس طرح کہ بھوکوں مرتا مزدور اس امید پر کہ وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے جسم کی توانائی قرض کے پیسوں کی خوراک خرید کر بحال کرے گا۔ اور اگلے مہینے خوب زیادہ محنت کر کے مالک کا قرض لوٹا دے گا۔ یہ سوچ کر وہ مالک کے سامنے دستِ تمنا دراز کر دیتا ہے اور مالک اس سنہری موقعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا بلکہ فوراً چند روپے بطور پیشگی دے دیتا ہے کیونکہ وہ دیتا کچھ ہے اور اپنے حساب کتاب میں لکھتا کچھ ہے، وہ رقم دگنی کر کے لکھ دیتا ہے اور پھر اس پر سود جاری ہوتا ہے بے چارہ مزدور سالہا سال تک صرف سود ہی ادا کرتا رہتا ہے اور اصل رقم کبھی نہیں اتر پاتی۔ اس صورتحال سے گھبرا کر کوئی ستم زدہ مزدور فرار ہونا چاہے تو اسے منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ کیونکہ دن رات ان پر جلاد —— چوکیداروں اور بھٹہ مالک کے چمچوں کا سخت پہرہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی مزدور ہمت کر بھی بیٹھے تو اس پر جھوٹے مقدمات قائم کر کے وارنٹ جاری کروا دیئے جاتے ہیں۔ اور پھر اسے زندگی کی عام قید سے رہائی دلا کر ایسی قید (جیل) میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ "جنسِ محنت" بھی نہیں فروخت کر سکتا جبکہ ادھر اس کی نوعمر لڑکیاں، معصوم بیوی بھٹہ مالک کی جنسی درندگی کا شکار بن جاتی ہیں۔

یہ تو اس مزدور کی بات ہے جس کی اولاد ہو، اور جس مزدور کی اولاد نہ ہو اسے بھٹہ مالک اس طرح دھکے دے کر نکال دیتے ہیں جیسے آم چوس کر چھلکا پھینک دیا جاتا ہے کیونکہ خونخوار بھٹہ مالک کے جبڑوں کو تازہ خون کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اس مزدور کی زندگی کا ڈراپ سین کچھ یوں ہوتا ہے کہ وہ بھکاریوں کی بھوکی فوج کا بھوکا سپاہی ہوتا ہے۔ یہی بھٹہ مزدور جو روزگار کے عدم تحفظ، بھوک افلاس، تنگ دستی، بیماری، فاقہ کشی، کسمپرسی اور سماجی پستی کے باوجود ان بلند و بالا عمارت کی بنیاد بنتا ہے۔ جس کی ایک ایک سرخ اینٹ میں اس کے لہو کا عکس نظر آتا ہے۔ اس مزدور کے اپنے کچے مکانات کی خستہ حالی کا آپ اس بات سے اندازہ لگا لیں کہ محکمہ موسمیات کی پیشین گوئی کے مطابق اگر بیس میل دور گرج چمک کے ساتھ بارش کا امکان ہو تو بھٹہ مزدور کے مکان زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ (یہ ایک کہاوت مشہور ہے)۔ جہاں تک زندگی کی تلخیوں کا تعلق ہے وہ تو بے شمار ہیں۔ زندگی کی کوئی بھی بنیادی سہولت انھیں حاصل نہیں۔ پورے پنجاب میں ان کے لئے ایک بھی ڈسپنسری نہیں۔ جبکہ بھٹہ مزدوروں کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کر جاتی ہے۔ حکومت تو شاید انھیں باقاعدہ شہری بھی تسلیم نہیں کرتی۔ کیونکہ حالیہ مردم شماری میں ۹۰ فیصد مزدوروں کی مردم شماری نہیں کی گئی اور نہ ہی انہیں باقاعدہ ووٹ ڈالنے کا حق حاصل ہے۔ اسی کا نام تو جمہوریت ہے کیونکہ استحصالی طبقوں کو جمہوریت کی صرف اتنی ضرورت ہے کہ عوام کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی رہے اور کھلنڈرے شہزادے ایوانوں میں رنگ رلیاں مناتے رہیں، چاہے قوم کے ایک بہت بڑے حصے کو پسماندہ ترین سماجی شرائط پر جبراً زندہ رکھا گیا ہو۔ اس صورتِ حال میں پورے یقین سے فیصلہ کن انداز میں کہا جا سکتا ہے کہ بھٹے ظلم و ستم کے خود مختار چھوٹے چھوٹے اڈے ہیں۔ جو ملک کے اقتدارِ اعلیٰ اور اس کے قانون کی زد سے باہر ہیں۔

کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ پانچ دریاؤں کی سرزمین پر لوگ روزمرہ استعمال کے پانی کے لئے ترستے ہوں گے؟ جی ہاں! ایسا ہوتا ہے۔ ایک ہزار بھٹہ مزدوروں کے لئے صرف ایک ہینڈ پمپ ہوتا ہے۔ لانڈھی اور سائٹ کے مزدور ان سے زیادہ خوش قسمت ہیں۔ ان تمام دکھوں اور مصیبتوں کے باوجود بھٹہ مزدور ہے کہ برابر اینٹیں تیار کئے جا رہا ہے، دنیا و مافیہا سے بے خبر —— کہ اچانک ایک زوردار گرج سے گھبرا جاتا ہے، دیکھتا ہے کہ مالک سر پر کھڑا ہے اور اس کی تمام دن کی محنت سے تیار کی ہوئی سینکڑوں اینٹوں کو توڑ پھوڑ دیتا ہے کہ ان کی بناوٹ ٹھیک نہیں۔ صبح سے شام تک کی محنت کو یوں تباہ ہوتا دیکھ کر اگر کوئی مزدور بزبانِ خموشی احتجاج کرے اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تو اسے چمنی سے باندھ کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ آج تک بھٹہ مالک کئی بھٹہ مزدوروں کو قتل کر چکے ہیں جس کی کوئی پوچھ کچھ نہیں، کوئی حساب کتاب نہیں، وہی قاتل وہی منصف۔ کس سے فریاد کریں، کس سے منصفی چاہیں موسم کی نرمی اور سختی سے بے نیاز زندہ رہنے کیلئے مسلسل جدوجہد کرتی ہوئی ان کچلی روحوں کو پتھیرے، جلیا، بھریا، نکلیا وغیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پتھیرے کی کہانی تو آپ اوپر پڑھ ہی چکے ہیں، جلیا کی حالت بھی اس سے کچھ بہتر نہیں۔ اس کی ماہوار تنخواہ صرف ۱۰۰ روپیہ ہوتی ہے، جس میں اسے تیس روپیہ من آٹا خریدنے کے لئے ۱۲ گھنٹے بھٹے میں آگ جلانی ہوتی ہے۔ بھٹہ تو ان کی چتا ہے۔ متعدد بار وہ خود آگ جلاتے جلاتے جھلس جاتے ہیں جس کا دکھ اس دھرتی پر شاید کسی کو نہ ہو۔ اور ہاں اسے چھٹی تمام عمر میں ایک بھی نہیں ملتی۔ چاہے وہ عید ہو، تہوار ہو غم ہو، خوشی ہو۔ پیٹ کا تنور بھرنے کے لئے اسے آگ جلائے رکھنا پڑتی ہے۔ نکاسی والا بھی جلیا کا بھائی ہوتا ہے جو گرم گرم اینٹیں ٹھنڈے جذبات کے ساتھ بھٹے میں سے نکالتا رہتا ہے۔ اور لوہے کے ذرات کی طرح گرم ریت اس کے جسم پر پڑتی رہتی ہے۔ اور یوں مسلسل ریت پڑتے پڑتے ان کا جسم خاکی خاک کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ ان ہی کی صف میں ایک اور نمائندہ ہے جسے بھریا کہتے ہیں، بھریے ایک فرلانگ سے لے کر تین فرلانگ تک سے گدھوں پر اینٹیں لاد کر لاتے ہیں، بھریا اور گدھے دونوں اتنی محنت کرتے ہیں کہ گدھے اور انسان میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔ اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ بھریے کو اپنی جان اور روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے ساتھ گدھے کو بھی زندہ رکھنا ہوتا ہے۔ اور ہر وقت پریشان رہتا ہے کہ اپنا پیٹ بھرے یا گدھے کا —— تباہ حالی کے اس عالم میں ان کے پاس سونے کے لئے چارپائی تک نہیں اور وہ اینٹوں کو جوڑ کر اس پر اپنے جوڑ جوڑ دکھتے ہوئے جسم کو آرام کی غرض سے بے آرام کرتے

ہیں —— یہ تو تھی ظالموں اور مظلوموں کی کہانی —— اب شکوہ ہے ان باشعور انقلابیوں سے جو ظالموں کیخلاف مظلوموں کی تنظیم کرتے ہیں۔ جو ناانصافی اور لوٹ کھسوٹ کے اس سماج کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ کچلے ہوئے طبقات کی قوت سے پرولتاریہ کی رہنمائی ہیں —— وہ اس سب سے زیادہ کچلے طبقے، دیہی پرلتاریہ کی تنظیم اور جدوجہد میں راہنمائی کا فرض ادا نہیں کرتے کیونکہ وہاں ظلم کا براہِ راست مقابلہ گرم گرم تقریروں اور سرد عمل سے نہیں بلکہ توانا عمل اور سیدھی سادھی باتوں سے کرنا پڑتا ہے۔ اور آج تو میدان وسیع ہے۔ ہشت نگر کے کسانوں اور کراچی کے مزدوروں کی لہو کی توانائی سے برف پگھلنے لگی ہے۔ بھٹہ مزدوروں کی آنکھیں رفتہ رفتہ کھلنے لگی ہیں

کے موجودہ سرکاری ادارے کو سجاوٹ کی چند مخصوص اشیاء کے بجائے وسیع تر گھریلو صنعتوں اور عوامی ضروریات کی اشیاء، جس میں چارپائی کا بان بھی شامل ہے، پر توجہ دی جائے۔ بان کا خام مال یعنی پھیش کی سستے نرخوں پر فراہمی اور تیار شدہ بان کی مارکیٹ کے نرخ مطابق خریداری کا انتظام کیا جائے

کوٹری

بان کے محنت کشوں کو استحصال سے نجات دلائی جائے

احسان عظیم

گزشتہ چھ سالوں سے مستقلاً بارش نہ ہونے کے نتیجہ میں دادو، کوہستان اور ٹھٹھہ اضلاع کے کوہستانی علاقوں کے لاکھوں خاندان قحط جیسی کیفیت سے دوچار ہیں۔ ان متاثر خاندانوں کی خاصی بڑی تعداد شہروں اور سندھ کے دیگر میدانی علاقوں کی طرف روزگار کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔

کوہستانی علاقے کے عوام کا زراعت کے بعد دوسرا سب سے بڑا ذریعہ معاش چارپائی کی بان (جسے سندھی زبان میں واڻ کہتے ہیں) کی گھریلو صنعت ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تعلقہ جوہی کے گاج ایریا، سیہون، کوٹری اور محال کوہستان کے علاوہ ٹھٹھہ ضلع کے کوہستانی علاقے کے مطابق تقریباً دس ہزار خاندان براہِ راست واڻ کی گھریلو صنعت سے وابستہ ہیں۔

بان کا خام مال جسے سندھی میں پھیش کہتے ہیں، کیرتھر رینج کی پہاڑیوں میں اگنے والی کھجور جیسی جھاڑی کے پتوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ بان کے تاجر پہاڑیوں سے پھیش جمع کرا کے بان بنانے والوں کو دس روپے من کے حساب سے فروخت کرتے ہیں اور تیار بان انیس اور بیس روپے من کے حساب سے خرید کر شہروں میں ساٹھ سے لے کر اسّی روپے من تک فروخت کرتے ہیں اس طرح بان کے ذریعے اوسطاً فی من چالیس روپے منافع کماتے ہیں جبکہ ایک من بان کی تیاری پر خام مال دس سے بارہ روپے تک کا خرچ ہوتا ہے۔ اور بان بنانے والوں کو ایک من کی مزدوری آٹھ روپے کے قریب ملتی ہے۔

تقریباً پندرہ سال پہلے جبکہ آٹا ایک من تھا اور بازار میں بان چالیس روپے فی من فروخت ہوتا تھا۔ تاجروں نے دس روپے من پھیش کی فروخت اور انیس روپے من تیار شدہ بان خریدنا شروع کیا تھا۔ پندرہ سال کے طویل عرصے میں بان کی بازاری قیمت دگنی ہو چکی ہے۔ لیکن بان کے تاجروں نے بان کی قیمتِ فروخت بڑھانے کے باوجود بان کی قیمتِ خرید میں اضافہ نہیں کیا ہے۔

بان بنانے والوں اور خشک سالی کے شکار محنت کشوں کی معاشی حالت کا اندازہ شہروں میں رہنے والوں کو نہیں ہو سکتا۔ کوہستانی علاقوں کے محنت کشوں کی یومیہ آمدنی مشکل سے ایک روپیہ فی خاندان بنتی ہے۔ مثال کے طور پر بان بنانے والوں کو ہی لیجئے۔ پھیش کی کٹائی، ریشہ بنانے کے بعد تمام دن میں تیز سے تیز کام کرنے والا ایک دن میں زیادہ سے زیادہ دو سیر بان تیار کر سکتا ہے۔ ایک من بان تیار کرنے پر تقریباً آٹھ روپے مزدوری بنتی ہے۔ اس طرح دو سیر کی مزدوری صرف چالیس پیسے بنی۔ اگر ایک خاندان کو چھ افراد پر مشتمل قرار دیا جائے اور بالغ افراد تین ہوں تو وہ صرف چھ سیر بان تیار کر سکیں گے۔ جس کی مزدوری صرف ایک روپیہ بیس پیسے ہوگی، جبکہ اشیائے خورد و نوش اور اجناس کے نرخ شہر کے مقابلے میں ڈیوڑھے اور اکثر اوقات دگنے ہیں۔ دوسری جانب تاجروں نے سودی قرضہ وغیرہ کے ذریعے ان دیہی محنت کشوں کو اپنے چنگل میں جکڑ رکھا ہے۔

ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے۔ ملک کی آبادی تقریباً ۷۵ فیصد زراعت اور دیہی معیشت سے وابستہ ہے۔ سرمایہ اور تکنیکی مہارت کی کمی کی بناء پر بڑے پیمانے پر صنعتی شعبہ کا پھیلاؤ ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے ملک کو ایسی ٹھوس اصلاحات کی ضرورت ہے۔ جس کے ذریعے ملک کے پیداواری وسائل اور افرادی قوت کو مکمل اور بھرپور طریقے پر استعمال کر کے تیز رفتار معاشی ترقی کی جا سکے۔

حکومت نے موجودہ مالی سال کے دوران سندھ میں تقریباً ۲۶ کروڑ روپے کے اخراجات کے ذریعے دیہی ترقی کا منصوبہ بنایا ہے۔ جس میں گھریلو صنعتوں کی بھی ترقی شامل ہے۔ اگر حکومت واقعی دیہی آبادی کی ترقی اور عوام کی خوشحالی چاہتی ہے تو ضروری ہے کہ گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کے فروغ

کراچی

ترازو والے ملازمین کے مفادات کا سودا کر رہے ہیں

نیشنل فیڈریشن آف بنک ایمپلائز کے صدر اسلام حسین نے ایک اخباری بیان میں کہا ہے کہ اس وقت تمام رجعت پسند قوتیں متحد ہو کر جمہوریت اور سوشلزم کے خلاف محاذ آرائی کر رہی ہیں۔ ملک میں تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات، صوبائی اور لسانی منافرت کو ہوا دینے کی منظم مہم اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ رجعت پسند قوتیں جماعت اسلامی کی رہنمائی میں ایک بار پھر ملک میں آمرانہ نظام لانے کی سازش کر رہی ہیں۔

اسلام حسین نے کہا کہ آج بنگلہ دیش کی مخالفت میں ہنگامہ آرائی کرنے والی جماعت اسلامی درحقیقت ملک کی جارحانہ تقسیم کی ذمہ دار ہے۔ جب یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان میں جمہوریت کا قتلِ عام کر کے عوام کے منتخب نمائندے سے اقتدار چھین کر اپنے پٹھوؤں میں تقسیم کرنا شروع کیا سب سے زیادہ حصہ جماعت اسلامی نے لیا تھا۔

فیڈریشن کے صدر نے کہا کہ اس جماعت اسلامی نے سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کر کے مزدوروں کے اتحاد کو بھی زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ مزدور خواہ کسی صوبے یا مقام سے تعلق رکھتا ہو اس کے مسائل یکساں، مقاصد ایک اور جدوجہد مشترک ہے لیکن جماعت اسلامی نے مذہب کی آڑ لے کر مزدوروں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔

نیشنل بنک کا ذکر کرتے ہوئے جناب اسلام حسین نے کہا کہ جماعت کے آلۂ کار ایمپلائز فرنٹ نے ۱۹۷۰ء میں نام نہاد اسلام پسندی کا نعرہ لگا کر ریفرنڈم جیتا تھا۔ لیکن ترازو کو اپنا انتخابی نشان بنانے والے فرنٹ کے لیڈر اب مطالبات کا فریب دے کر ملازمین کی حمایت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بنک کے اسلام پسند افسران ریفرنڈم کے عین موقع پر فرنٹ سے معاہدہ کر کے ملازمین کے مفاد کا سودا کر رہے ہیں لیکن اب اس سازش کے باوجود ایمپلائز فرنٹ کا چہرہ بے نقاب ہو چکا ہے

کھڈی کے پچاس ہزار مزدور بے روزگار ہو جائیں گے

شمس الحسن شمس

گذشتہ دنوں کورنگی جانے کا اتفاق ہوا۔ کورنگی تو بہر حال بہت دور تھی ابتدائی مرحلہ صدر سے شروع ہوا جب میں صدر میں کورنگی کے بس اسٹاپ پر پہنچا تو وہاں لوگوں کا اژدھام پایا جن کا احاطہ کرنا نگاہوں سے ممکن نہ تھا جدھر بھی نگاہ اٹھی لوگوں کا ایک جم غفیر پایا جو کورنگی کی بسوں کا نہ جانے کب سے منتظر تھا اور بسیں تھیں کہ آنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں کافی دیر بعد ایک جھومتی جھامتی بس اپنے جلو میں ڈھیر سارا دھواں چھوڑتی ہوئی آکر ٹھہر گئی بس ہر کیا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس کسی اور دنیا کی مخلوق ہے اور تمام افراد اس کی قربت کے لئے زور آزمائی میں مصروف تھے۔ جو شخص جہاں تھا اس کی وہیں سے کوشش یہی تھی کہ بس میں پہلا قدم اس کا پڑنا چاہیئے۔ کچھ نے تو کھڑکیوں کے راستے ہی اچھل کود شروع کر دی خیر کافی دیر بعد یہ دنگل ختم ہوا۔ اور بس دوبارہ کورنگی کی طرف چل دی۔ میں نے بھی خود کو بس میں موجود پایا لیکن یہ نہیں بیان کر سکتا کہ کس طرح یہاں تک پہنچا۔ ادھر کنڈیکٹر نے روانگی کی وسل دی ادھر لوگوں کی زبانیں بھی میکانکی انداز سے شروع ہو گئیں وہ کونسا مسئلہ تھا جو اس بس میں زیرِ بحث نہ تھا جن لوگوں کو اس ادھیڑ بن میں حصہ نہ ملا انہوں نے آپس ہی میں لڑنا شروع کر دیا۔ مجھے بھی اس ہنگامہ محشر میں اپنی خموشی بڑی گراں گذری میں نے اپنے لبوں کا قفل توڑتے ہوئے قریب کھڑے ہوئے بڑے میاں سے دریافت کیا آخر آج کیا بات ہے جو اتنا شور ہے۔ بڑے میاں نے شک بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا پردیسی لگتے ہو بھیا خیر دو ایک دفعہ آؤ گے تو عادی ہو جاؤ گے یہ سب دیکھتے ہوئے میری آنکھیں بوڑھی ہو چکی ہیں۔ سنتے ہیں بسیں ڈپو میں کھڑی رہتی ہیں لیکن انہیں روڈ پر نہیں لایا جاتا نہ جانے کیا مصلحت ہے۔ ہم آپس میں محو گفتگو تھے کہ کورنگی شروع ہو گیا ہر اسٹاپ پر کچھ لوگوں سے بس خالی ہو جاتی اور یک گونہ کشادگی کا احساس بڑھتا جاتا میں بھی ایک اسٹاپ پر اتر گیا پتہ چلا یہ کے ایریا اسٹاپ ہے۔ گلیوں میں پانی کی نہریں دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ یہاں کے لوگوں کو پانی کی تکلیف نہیں ہوگی جیسے اور علاقوں میں ہوتی ہے۔ ان بہتے ہوئے پانی پر بڑے بڑے پتھر رکھ کر لوگوں نے عوامی پل تعمیر کر رکھے تھے جن پر سے لوگ گذر رہے تھے لیکن جلد ہی میری غلط فہمی دور ہو گئی پتہ چلا کہ یہ تو گھروں کا گندا پانی ہے۔ کیونکہ یہاں گھروں کے گٹر بند ہیں۔ ہاں کبھی کبھار بلدیہ والے آجاتے ہیں کہ وہ سروے کرنے آتے ہیں تاکہ ڈرینج سسٹم درست کر سکیں لیکن شام ڈھلے وہ چلے جاتے ہیں اور ان معمولات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ میں نے آگے جاکر دیکھا بڑے بڑے چرخوں پر رنگ برنگ کا دھاگہ لپیٹا جا رہا ہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پتنگ کا مانجھا تیار ہو رہا ہے۔ اسی جگہ ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا میں بھی اس ہوٹل میں چائے پینے کے لئے داخل ہو گیا۔ ہوٹل میں ایک آدمی اونچی آواز سے اخبار پڑھ رہا تھا اور بہت سے عمر رسیدہ لوگ بڑے غور سے اخبار سن رہے تھے شاید اخبار میں سوت کے بارے میں کوئی خبر تھی اخبار کی خبر ختم ہوئی تو ہوٹل میں دھاگے کے بارے میں گرما گرم بحث شروع ہو گئی ہر آدمی دھاگے کے بارے میں پریشان تھا اتنے میں ہوٹل والے نے مجھے دیکھ کر آواز دی چینی یا (چائے) پیو گے اور میں نے مسکرا کر ہاں کر دی ہوٹل والے نے چائے کا چھوٹا سا گلاس لاکر میرے سامنے میز پر رکھ دیا اور میں پھر ہوٹل میں دھاگے کی بحث سننے لگا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ دھاگہ اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ ہماری قوت خرید سے باہر ہے اور کوئی کہہ رہا تھا کہ ہماری کھڈیاں بند ہو جائیں گی۔ اور ہم بے روزگار ہو جائیں گے اور کوئی کہہ رہا تھا کہ حکومت نے ابھی تک دھاگے کے بارے میں کچھ نہیں کیا اور مل مالکان برابر سوت مہنگا کرتے جا رہے ہیں۔

میں نے ایک بڑے میاں سے مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے استفسار شروع کر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ کھڈی کا کپڑا تیار کرنے کے لئے ان لوگوں کو سوت بولٹن مارکیٹ سے لانا پڑتا ہے۔ اب سوت حاصل کرنے میں پہلے جیسی دقت تو نہیں رہی لیکن دھاگے کی قیمتیں بہت بڑھا دی ہیں۔ انہوں نے اعداد و شمار بتاتے ہوئے بتایا کہ ایک بنڈل سوت جو کہ ۱۹۶۶ء میں ۲۱ روپے کا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں ۲۶ روپے، ۱۹۷۱ء میں بڑھ کر ۳۱ روپے ہو گئی اور اب اس کی قیمت ۵۲ روپے ہے۔ جب کہ دوکاندار ہم سے کپڑا اسی قیمت پر لیتے ہیں جس پر پہلے لیا کرتے تھے۔ حکومت کی جانب سے مقررہ ریٹ نہ ہونے کے سبب ان کی قیمتوں میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستان میں صرف دو دفعہ دھاگے کے نرخ مقرر کئے گئے ایک دفعہ محمد علی بوگرہ کے دورِ وزارتِ عظمیٰ میں اور اس کے بعد ایوب خاں کے عہدِ حکومت میں۔ اس دوران مل مالکان نے بازار سے دھاگا غائب کر کے مصنوعی قلت پیدا کر دی۔ کیونکہ ڈھاکہ میں مل مالکان کی اجارہ داری تھی۔ یحییٰ خاں کے دورِ حکومت میں دھاگے پر ٹیکس لگا جواب تک برقرار ہے۔ جس کی شرح درج ذیل ہے۔

سوت سنگل نمبر ۱ سے ۲۰ تک ۵، پیسے فی پونڈ سنگل سوت نمبر ۲۱ سے ۳۵ تک ڈیڑھ روپیہ فی پونڈ ۳۵ سے ۵۵ تک ڈھائی روپے فی پونڈ۔ گو شرح ٹیکس میں اضافہ نہیں ہوا لیکن قیمتوں میں اضافے کی کوئی حدود انتہا ہی نہیں۔ اور پھر سرمایہ دار مختلف دھاندلیوں کے ذریعہ ٹیکس بچانے کی کوشش میں رہتے ہیں ۲۰ نمبر اور ۲۱ نمبر سنگل سوت میں کوئی فرق نہیں لیکن شرح ٹیکس میں چونکہ فرق ہے لہٰذا سنگل نمبر ۲۱ کا جو دھاگہ آتا ہے اس پر ۲۰ نمبر کی مہر ہوتی ہے۔ اس طرح ملز مالکان ایک بنڈل پر ٹیکس کے ۷، روپے ۵۰ پیسے بچا لیتے ہیں۔

بابا نے کہا کہ ہمارے یہاں بچے عورتیں سب ہی کام کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر خاندان کے تمام افراد کام نہ کریں تو پورا تھان نہیں بن سکتا اگر سوت کے بارے میں حکومت نے کوئی مؤثر قدم نہ اٹھایا تو کراچی کے تقریباً پچاس ہزار آدمی بے روزگار ہو جائیں گے حکومت کو چاہیئے کہ وہ مل مالکان سے کہے کہ سوت کی مصنوعی قلت ختم کریں اور سوت سستا کریں۔

عورتوں کا مستقل کالم شروع کیجئے

عبدالوہاب ایڈووکیٹ

"الفتح" کے قاری اور ہمدرد کی حیثیت سے "الفتح" پر تعمیری تنقید کی دعوت دی گئی ہے۔ تنقید کی گنجائش بہت کم ہے کیونکہ فی الحال آپ صحیح راستے پر گامزن ہیں۔ مگر "الفتح" میں ایک کمی ہے وہ یہ کہ عورتوں کے بارے میں ایک مستقل کالم شائع کیا کریں۔ جس میں یہ بتایا جائے کہ عورتیں کس طرح اور کیونکر اپنی گھریلو زندگی میں سوشلزم اور اس کے اصولوں کو اپنا سکتی ہیں۔ اور اپنے بچوں، خاوند اور خاندان پر کس طرح اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ اور یہ بھی بتایا جائے کہ سوشلسٹ ممالک میں عورتوں نے اس سلسلے میں کیا کردار ادا کیا۔



صدر صاحب!

ہمارے حقوق پامال ہو رہے ہیں

آپ کے عوامی جریدے کی وساطت سے صدر مملکت جناب ذوالفقار علی بھٹو، کی توجہ فشریز کو آپریٹیو سوسائٹی میں مبینہ غیر قانونی بھرتی کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

اس ادارے کو قائم ہوئے تقریباً ۱۳، ۱۴ سال ہوئے ہیں۔ لیکن آج تک کسی بھی ملازم کو ترقی نہیں دی گئی۔ اور اگر چند اکا دکا ملازمین کو ترقی دی بھی گئی تو وہ بھی صرف ڈائریکٹر حضرات کے عزیزوں، دوستوں اور کاسہ لیسیوں کو دی گئی۔

اس ادارے میں قابل، ہونہار اور محنتی افراد ملازم ہیں۔ بعض ایم۔اے اور بی۔اے ہیں اور کئی سالہ دفتری تجربہ رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے ادارے کی ترقی اور توسیع کے لئے رات دن محنت اور جفاکشی سے کام کیا۔ لیکن اس ادارے کے چیئرمین اور ڈائریکٹروں نے ہمیشہ قابل اور جفاکش اسٹاف کو محنت کا صلہ یہ دیا کہ جب کبھی بھی سوسائٹی میں کسی اسسٹنٹ سپروائزر یا افسر کی کوئی آسامی خالی ہوتی تو اپنے ناقابل اور ناتجربہ کار دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کو چور دروازے سے ملازم رکھ لیا گیا۔ جس کا ثبوت آسانی سے سوسائٹی میں ۱۹۷۰ء سے تقرر کئے ہوئے سفارشی ملازمین سے کیا جا سکتا ہے۔ اور ایسے سفارشی ملازمین کی قابلیت کا اندازہ ان کی جوائننگ رپورٹ سے کیا جا سکتا ہے جو کہ بالکل لکھنا نہیں جانتے۔

ابھی حال ہی میں اس ادارے کی یونین نے پرانے ملازمین کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں اور غیر قانونی بھرتی بند کرانے کے متعلق ایک درخواست دی۔۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز نے اس درخواست پر کوئی توجہ نہیں دی اور غیر قانونی بھرتی کا سلسلہ جاری رکھا۔

ڈائریکٹروں کے بورڈ نے حسب معمول پھر ہٹ دھرمی کر کے ایک ایسے زمیندار کے بیٹے کو بطور سپروائزر تقرر کر لیا۔ جو صرف انٹرمیڈیٹ ہے اور سابقہ تجربہ کچھ بھی نہیں رکھتا۔

اس ادارے کی تاریخ میں اسی طرح کی ناانصافیوں اور پرانے ملازمین کے استحصال کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

صدرِ محترم! آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے الیکشن سے پیشتر وعدہ کیا تھا کہ "ہم ایک ایسا نظام قائم کریں گے جو استحصال سے پاک معاشرہ ہوگا اور پھر کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ سب کے ساتھ انصاف ہوگا۔"

لیکن جناب صدر! آپ کی پارٹی کے چار ایم پی اے جو اس ادارے کے چیئرمین اور ڈائریکٹرز ہیں، اب بھی ہم پرانے ملازمین کو ترقی نہیں دیتے۔ جس کے ہم حقدار ہیں۔ ہمارے حقوق کو پامال کیا جا رہا ہے۔

صدرِ محترم! امید ہے کہ آپ غیر قانونی طور پر بھرتی کئے ہوئے تمام سفارشی تقرریوں کو منسوخ کرا کر ہم غریب پرانے ملازمین کے حقوق کا تحفظ کر کے ہم لوگوں کا استحصال ختم کرائیں گے۔

——— (ایم رفیع)

بزمِ "الفتح"

بزمِ "الفتح" کی پندرہ روزہ ادبی و تنقیدی نشست اتوار ۷ جنوری ۱۹۷۳ء کو لانڈھی کالونی میں ہوگی۔ تمام ترقی پسند افراد سے درخواست ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کر کے اس نشست کو کامیاب بنائیں۔

پروگرام

نظم ——— وقار فاروق

افسانہ ——— ابن حسن

تاریخ ——— ۷ جنوری ۱۹۷۳ء

وقت ——— شام ساڑھے ۴ بجے

مقام: ۲۱۳، سیکٹر ۳ سی، اسٹریٹ نمبر ۱۳ لانڈھی کالونی (بس اسٹاپ نمبر ۳)

تمام نوآموز ادیبوں اور شاعروں سے درخواست ہے کہ وہ "بزمِ الفتح" کے سلسلے میں ہم سے رابطہ قائم کریں۔

بقیہ: غفار خان

گولیوں سے بھون ڈالا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس فائرنگ میں ساڑھے چار سو افراد ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ پولیس نے طے شدہ منصوبے کے مطابق لاشوں کو ٹرکوں میں بھر کر نامعلوم مقام پر پہنچا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ لاشیں دریا کی نذر کر دی گئیں۔ فائرنگ کے بعد بھی قیوم خان کی آگ سرد نہ ہوئی۔ ان کے حکم پر خدائی خدمت گاروں کا منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرایا گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد غفار خان پہلی مرتبہ ۱۵ جون ۴۸ء کو گرفتار کئے گئے۔ تین سال کی سزا دی گئی۔ اور جب یہ تین سال پورے ہوئے تو بنگال ریگولیشن کے تحت مزید تین سال کی سزا دی گئی۔ اور آخر کار جنوری ۱۹۵۴ء میں رہا کر دیئے گئے۔ جب ون یونٹ بنایا گیا تو غفار خان نے اس کے خلاف تحریک چلائی۔ اور جون ۵۶ء میں اپنے ہی برادرِ بزرگ ڈاکٹر خاں صاحب کے حکم پر گرفتار کئے گئے۔ بغاوت اور پاکستانی باشندوں میں نفرت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ جو مغربی پاکستان کی عدالتِ عالیہ میں چھ سات ماہ زیرِ سماعت رہا۔ ۲۴ جنوری ۱۹۵۷ء کو تابرخاستِ عدالت سزائے قید اور ۱۴ ہزار روپے جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا گیا۔

رہائی کے بعد غفار خان، نیشنل عوامی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اور چند سال خاموش زندگی بسر کرنے کے بعد افغانستان چلے گئے۔ ان کی خود اختیاری جلاوطنی نے عوام کے دلوں میں شک و شبہات پیدا کئے۔ کیونکہ افغانستان ہمیشہ پاکستان کی نسبت بھارت سے زیادہ قریب رہا ہے۔

غفار خان نے افغانستان سے واپسی پر ایران، افغانستان، پاکستان اور بھارت پر مشتمل "امن کور" بنانے کی تجویز پیش کی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ غفار خان جیسے زیرک سیاست دان نے یہ تجویز کیوں کر پیش کی۔ جب کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان چاروں ملکوں کے نظامِ حکومت اور برسرِ اقتدار طبقے کے مفادات مختلف ہیں۔ افغانستان اور بھارت پر روس کا اثر زیادہ ہے، پاکستان اور ایران پر امریکہ کا، ان حالات میں چاروں ممالک پر مشتمل "امن کور" کیونکر بن سکتی ہے۔

بقیہ: سرورق کی کہانی

ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری پر قابو نہیں پایا جاتا۔ غریبوں کو راشن کارڈوں کے ذریعے چھٹانک چھٹانک بھر چینی تقسیم کی جا رہی ہے، لیکن امیر تاجروں کے گودام اناج سے بھرے پڑے ہیں۔ متعلقہ حکام کو بڑی بڑی رشوتیں مل رہی ہیں، وہ ان چوروں کا احتساب کیوں کریں۔

اگر گرانی کا خاتمہ کرنا ہے تو ان لعنتوں پر قابو پایا جانا چاہیئے۔

بقیہ: افسانہ "کلرک"

بھی کرنا ہوگا"

پھر ایک روز اچانک اُسے ریاض کی اپنے اکاؤنٹنٹ کی بیٹی سے شادی کی خبر ملی تو اس کے قدموں سے زمین نکل گئی۔

"ایسا کیوں ہوا، ریاض ایسا تو نہ تھا" شام کو زینب گھر میں اکیلی تھی بھائی باہر گیا ہوا تھا شاید وہ ریاض کے گھر گیا تھا۔

"دستک" سن کر اس نے دیکھا کہ ململ کا سفید کرتہ اور سفید پائجامہ پہنے ریاض کھڑا تھا۔ آج زینب نے اسے اندر آنے کیلئے کہا تو وہ اندر نہیں آیا بڑی بجھی سی آواز میں بولا "زینب مجھے دراصل تجھ سے ہی کچھ کہنا ہے" وہ بہت سنجیدگی سے بول رہا تھا ایسا وہ پہلے کبھی نہ تھا "میں نے تمہیں ایک بار کہا تھا کہ میری بہن کو تم جیسی بھابی کی خواہش ہے مگر افسوس اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے گی" چند لمحے بوجھل بوجھل گذر گئے پھر دھیرے سے زینب نے کہا "میں یہ پوچھنے والی کون ہوتی ہوں۔ پھر بھی کہے بنا نہ رہ سکی ایسا کیوں ہوا کیوں ہوا"

"کیوں ہوا ———" ریاض نے زیر لب اس کے الفاظ دہرائے "زینب مجھے اپنی بہن کا بھی بیاہ کرنا ہے اور میری فکر وہی ہے جو صفدر کی ہے" "ہم لوگ تاجر اور خود غرض ہیں زینب ہمیں دلہنیں نہیں جہیز چاہیئے کیونکہ ہماری اپنی بہنوں کو جہیز کی ضرورت ہے" وہ یہ کہتے ہوئے بہت شرمسار ہو رہا تھا اس نے اپنے سوداگر اور بیوپاری ہونے کا آج کھلے عام اظہار کر دیا تھا۔ پھر وہ اچانک بولا تم مجھے معاف کرنا۔ اچھا،...... اندھیرا ہو رہا ہے میں چلتا ہوں" اور زینب اسے روک نہ سکی۔

صفدر واپس لوٹا تو اس نے دیکھا کہ زینب بے خیالی میں چولہے میں لکڑیاں ٹھونس رہی ہے، اس نے آج بجلی بھی نہیں جلائی تھی "زینب..... ارے زینب اندھیرے میں ڈر نہیں لگتا بجلی کیوں نہیں جلائی" اور جب صفدر نے بجلی جلائی تو اس نے دیکھا کہ زینب کے آنسو اس کے دوپٹے کا پلو بھگو رہے ہیں بھائی کا سامنا کرتے ہوا اس نے اپنے آنسو پونچھے اور روزمرہ کے لہجے میں بولی "بھائی ریاض آیا تھا"

بقیہ: کوٹری بیراج

کا بلند و بانگ دعویٰ کر رہی ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران متاثر ہونے والے کاشت کاروں کی دوبارہ آبادکاری کے لئے دس کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی، لیکن اس علاقہ کے تقریباً تیس چالیس ہزار کاشت کار خاندان کو محض اس وجہ سے بے دخل کر کے کوڑی کوڑی کا محتاج بنایا جا رہا ہے کہ وہ قدرتی آفات اور بدحالی کے سبب وقت پر سرکاری واجبات کی اقساط جمع نہیں کرا سکیں یہ اقدام ایک ایسی حکومت کو ہرگز زیب نہیں دیتا جو مزدوروں اور کسانوں کی حمایت سے برسر اقتدار آئی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ کوٹری بیراج کے کاشت کاروں کو سرکاری واجبات ادا کرنے ہیں انہوں نے اس بات سے انکار بھی نہیں کیا، وہ صرف واجبات کی ادائگی کی مقررہ مدت میں توسیع چاہتے ہیں، اگر نوکر شاہی کے حصے میں تھوڑی بہت عقل آتی اور عوامی ہمدردی کا جذبہ ہوتا تو وہ سب سے پہلے ان کاشت کاروں کو بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کرتی، اور اس علاقہ کو ہر طرح سے ترقی دی جاتی مگر ایسا قدم اٹھانے کی بجائے کاشت کاروں اور ہاریوں کے مسائل سے سنگین چشم پوشی اور سرد مہری کا مظاہرہ کیا گیا اور واجبات کی وصولی میں بھی ٹھیٹ نوکر شاہی اور جاگیردارانہ انداز اختیار کر کے ثابت کر دیا گیا کہ نوکر شاہی کو اس طبقے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جو اپنا خون دے کر فصل اگاتا ہے۔

بقیہ: پردہ چاک

کے کرداروں کی ہر بات اور ہر ایکشن پر بیک گراؤنڈ سے قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ کیا پروگرام منیجر نے کبھی ٹی وی کے سامعین سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ پروگرام کس حد تک پسند کئے جاتے ہیں؟ یہی نہیں ایسے سینکڑوں بوگس پروگرام روزانہ دکھا کر ٹی وی کے صارفین کو بور کیا جاتا ہے۔ اور پاکستانی عوام کے لاکھوں روپے امریکہ کے ٹی وی فلم ساز اداروں کو منتقل کر دیئے جاتے ہیں۔

ٹی وی کا ادارہ کسی حکومت یا پارٹی کی ملکیت نہیں ہوتا، بلکہ یہ عوامی ادارہ ہے۔ جس کا کام عوام کو معیاری تفریح فراہم کرنے کے علاوہ انہیں ملک کی صحیح سیاسی صورتحال سے باخبر رکھنا ہے۔ اگر اس معیار پر ٹی وی کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو ٹی وی کے ارباب اختیار سنگین غفلت کا شکار ملیں گے۔ سقوط ڈھاکہ کے دوران مغربی پاکستان کے عوام کو غلط اطلاعات اور جھوٹی فلموں کے ذریعہ فریب دیا جاتا رہا۔ اصل حقائق اور حالات کو قصداً چھپائے رکھا گیا اور "سب ٹھیک ہے" کے تحت پروگرام پیش کئے جاتے رہے۔ بعد میں جب مختلف ذرائع سے مغربی پاکستان کے عوام کو اصل حالات معلوم ہوئے تو ٹی وی پر سے ان کا اعتماد ہمیشہ کیلئے اٹھ گیا۔

موجودہ دور میں بھی کم و بیش وہی پرانے حالات ہیں۔ ٹی وی، برسر اقتدار طبقہ، امریکی پروپیگنڈہ فلموں اور معاشرے کے بالادست اور خوشحال متوسط طبقے کے فرسودہ خیالات پر مشتمل پروگراموں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ اس ملک میں عوام بھی رہتے ہیں۔ مزدور اور کسان بھی رہتے ہیں۔ جو شب و روز محنت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا پیٹ خالی ہوتا ہے۔ ان کے جسم کپڑوں کے لئے ترستے ہیں۔ اور کھلے آسمان کے نیچے بے سر و سامانی کے عالم میں زندگی گزارتے ہیں۔ کیا ٹی وی والوں کو ان کی زندگی، مشکلات اور پریشانیوں میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس پر وہ کوئی پروگرام ترتیب دے سکیں۔ اگر ٹی وی والوں میں عوام کے اکثریتی طبقے کے دکھ درد اور مسائل پر مبنی پروگرام پیش کرنے کی جرأت نہیں ہے تو کم از کم انھیں عوام کو حقیقتِ حال سے آگاہ کرنا چاہیئے عوام ان سے سوال کرتے ہیں کہ کیا ان میں اتنی اخلاقی ہمت ہے؟

بقیہ: جنوری تحریک

کر دیا تھا کہ وہ جدوجہد کی راہ میں کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ اور انہیں یہ شعور بخشا کہ ان کے بہترین ساتھی عوام ہوتے ہیں۔ انہیں عوام سے اپنے رشتہ کو مضبوط کرنا ہوگا۔

لاٹھیوں گولیوں کی بارش سے طلبہ تحریک نہیں رک سکتی جدوجہد کل بھی جاری تھی اور آج بھی جاری ہے۔ اور کل بھی جاری رہے گی جسموں کو گولیوں سے چھلنی تو کیا جا سکتا ہے مگر ذہنوں کو مقید نہیں کیا جا سکتا۔

جنوری تحریک اس جنگ کی ایک کڑی ہے جو سچائی اور جھوٹ، حق اور باطل، غربت اور امارت کی ازلی و ابدی جنگ ہے یہ ان دو طبقوں کی لڑائی ہے جو ہر مقام، ہر ملک اور ہر جگہ جاری ہے۔ جھوٹ، باطل، بدی اور امارت کی طاغوتی طاقتیں ہر جگہ متحدہ محاذ بنا کر سچائی، حق، غربت اور نیکی پر حملہ آور ہوتی ہیں لیکن گولیوں، بموں اور ٹینکوں کے باوجود سچائی کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ حق ہمیشہ ابھرتا ہے۔ غربت و نیکی ہمیشہ ظفریاب ہوتی ہے۔

لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ سچائی اور حق کی تمام طاقتیں غربت اور نیکی کی تمام قوتیں متحد ہو جائیں اور خود کو اس معرکے کیلئے تیار کریں۔